



## قرآن کا پیام

ہمارے نام

اپنی عزیز چیز کی قربانی کے بغیر

نیکی کی بہتر حالت تک رسائی کا نہ ہونا

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ۔ (سورۃ آل عمران آیت ۹۲) (تم نیکی کو ہرگز حاصل نہیں کر سکتے، جب تک تمہیں جن چیزوں سے محبت ہے، وہ (اللہ کی راہ میں) صرف نہ کرو)۔

اس آیت میں نیکی کا کمال اور معیار بیان فرمایا گیا ہے کہ جب تک اللہ کے لئے اپنی محبوب چیزوں کی قربانی نہ دی جائے، تب تک فرد مطلوبہ درجے کے نیکو کاروں میں شمار نہیں ہو سکتا، اللہ کے لئے اپنی عزیز چیزوں کے صرف کرنے میں مال بھی عزیز ہے تو اپنی رائے بھی عزیز ہے، وقت بھی عزیز ہے کہ وقت کی قربانی دینا فرد کے لئے دشوار تر ہوتا ہے، اللہ کے لئے مجاہدوں سے کام لینا یہ تو اور زیادہ دشوار تر ہوتا ہے۔

جب تک فرد اپنی ان عزیز ترین چیزوں کی اللہ کے لئے قربانی نہیں دے گا، تب تک اس کے اندر نیکی کی استعداد پیدا نہ ہوگی، اور اس پر صبغۃ اللہ (اللہ کا رنگ) غالب نہ ہوگا اور نیکی کے معیار اور کمال تک پہنچنا اس کے لئے محال تر ہوگا۔

اسلام بندے کا اس طرح کا مزاج پیدا کرنا چاہتا ہے کہ فرد ایثار اور قربانی کا مظہر بن جائے، اور فرد سے اسلام کا جس وقت جو بھی تقاضا ہو، اس تقاضے پر وہ لبیک کرتے ہوئے اسے پورا کرنے کے لئے تیار ہو جائے، مثلاً دین کے لئے مال کی ضرورت درپیش ہو تو مال کے ہوتے

ہوئے بھی فرد مائی قربانی دینے سے پس و پیش سے کام لے، یادین کے اجتماعی کاموں میں اپنی رائے کی قربانی دینے کی ضرورت لاحق ہو تو اس وقت فرد اپنی رائے پر ڈٹ جائے، اس طرح وہ اجتماعیت کو نقصان پہنچانے کا ذریعہ بنے، یا تزکیہ نفس کے لئے مجاہدوں کی ضرورت ہو تو فرد اس وقت قیل و قال میں تو آگے ہو، لیکن مجاہدوں کے لئے تیار نہ ہو جائے، یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جو اسلام کے قائم کردہ مطلوبہ مزاج اور معیار سے فروتر ہیں اور نیکی کے منافی ہیں۔

سب سے کٹ کر اللہ کے لئے یکسو ہو جانا

إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلذِّينِ فَطَرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا۔ (سورة الانعام آیت ۷۹)  
(میں نے اپنے آپ کو سب سے یکسو ہو کر اسی ذات کی طرف متوجہ کیا ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا ہے)۔

اس آیت میں سب سے کٹ کر اللہ کے لئے یکسو ہو جانے اور خالص اللہ کی رضا کے مطابق زندگی گزارنے کے عہد کا ذکر فرمایا گیا ہے، یہ آیت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حوالے سے ہے، وہ قوم سے کہتے ہیں میں تمہارے معبودوں سے براءت کا اظہار کرتا ہوں، میں اللہ کی ذات کے علاوہ کسی کو شریک نہیں کر سکتا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تتبع میں بندہ مؤمن کی بھی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ معبودان باطل وہ چاہے مادیت پرست قوتوں کی صورت میں ہوں یا نفس کی قوتوں کی صورت میں، وہ ہر طاغوت سے براءت کا اظہار کر کے ہر صورت میں اپنے آپ کو اللہ کی عبادت و اطاعت کے لئے مخصوص کرتا ہے، ہر دور میں بندہ مؤمن کی یہی خصوصیات اور یہی شان ہوتی ہے، وہ اپنے زمانے کی مقتدر قوتوں اور باطل افکار سے کسی صورت میں مرعوب نہیں ہوتا، نہ تو وہ اپنے دور کے باطل افکار سے ذہنی طور پر متاثر ہوتا ہے اور نہ ہی وہ عملی طور پر عقیدہ توحید اور خدا پرستی کی راہ سے سر مو انحراف کرتا ہے، وہ اللہ سے والہانہ محبت کرتا ہے، وہ اس محبت کے زیر اثر اللہ کی تعلیمات کے مطابق پوری زندگی گزارنے کے لئے کوشاں ہوتا ہے، یہ آیت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حوالے سے بندہ مؤمن کے اس مستقل عزم کا

اظہار ہے کہ اگر ساری دنیا، توحید پرستی کی راہ کی مخالف بھی ہو جائے تو اسے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوگی وہ تنہا اللہ کی عبدیت کا نمونہ بن کر زندگی گزارے گا۔

موجودہ دور مادیت پرستی کا دور ہے، مادیت میں کچھ ایسی کشش ہے کہ دلیں اس کی طرف کھینچی ہوئی چلی جا رہی ہیں، عالمی طاغوت نے لوگوں کو معاشیات اور معاشی گرفت میں اس طرح جکڑ لیا ہے کہ فرد کے لئے یکسو ہو کر اللہ کی عبادت و اطاعت کے لئے نہ ذہن آمادہ ہے اور نہ ہی جسمانی نظام یعنی جسم اس کے لئے تیار ہے، اس طرح کے حالات میں وہ بندہ مؤمن جو مادیت کی اس طوفان خیز لہروں کا مقابلہ کر کے اللہ سے اپنے رشتے کو مستحکم سے مستحکم کرتا ہے، وہ خوش نصیب ترین انسان شمار ہوگا، وہ حضرت ابراہیم اور حضور ﷺ کی اسوہ حسنہ پر گامزن ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمارا اس طرح کے بندہ مؤمنوں میں شمار فرمائے۔

کچی اختیار کرنے کے نتیجے میں

دلوں کا ٹھیرا ہونا

فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ (سورة الصف آیت ۵) (پس جب انہوں نے کچی اختیار کی تو اللہ نے ان کے دلوں کو ٹھیرا کر دیا)۔

كَلَّا لَمَ سَرَّانَ عَلِي قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ۔ (سورة المطففين آیت ۱۵) (ہرگز نہیں، بلکہ ان کے دلوں پر زنگ چڑھ گیا ہے، ان کے کرتوتوں کی وجہ سے جو وہ کیا کرتے تھے)۔

ان آیات میں کچی اختیار کرنے اور اعمال بد کے نتیجے میں دلوں کو ٹھیرا کرنے اور دلوں پر زنگ لگ جانے کا انتباہ دیا گیا ہے، یہاں دراصل اللہ کا یہ اصول بتایا گیا ہے کہ جب ایمان اور اعمال سے غفلت و بے توجہی بلکہ سرکشی اختیار کی جائے گی تو اس کے لازمی نتیجے کے طور پر دل کی وہ حالت باقی نہیں رہتی کہ وہ حق اور حق بات کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو، دلوں پر زنگ

لگ جانا، یہ بہت بڑی سزا ہے، جو اعمال سے غفلت کے نتیجے میں ملتی ہے، یہ سزا دراصل فرد کے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔

### سینہ کی تنگی سے بچاؤ کی صورت

وَلَقَدْ نَعَلْنَاكَ يٰعِزُّيُّ صَدْرَكَ بِمَا يَفْعُلُونَ فَسَجَّ بِحَنْدِ رَبِّكَ وَكُنَّ مِنَ الشَّاجِدِينَ -  
(سورۃ الحجر آیت ۹۷-۹۸) (اور ہمیں معلوم ہے کہ ان کی باتوں سے آپ کا سینہ تنگ ہوتا ہے تو تم اپنے پروردگار کی تسبیح کے ساتھ حمد کرتے رہو اور سجدہ کرنے والوں میں شامل ہو)۔  
اس آیت میں حضور ﷺ کے حوالے سے ہر دور کے داعی کو تلقین فرمائی جا رہی ہے کہ مخالفت کرنے والوں کی طرف سے جب سینہ میں تنگی درپیش ہو تو اللہ کے ذکر، اس کی تسبیح میں مصروف ہوں اور سجدوں سے کام لیں، اس سے مخالفین کی الٹی سیدھی باتوں کے اثرات کے ازالے کی صورت پیدا ہوگی اور سینے میں کشادگی پیدا ہوگی۔

اللہ کی طرف بلانے کی دعوت ایسی ہے، جسے ہر دور کے نفس پرست انسان بالخصوص مقتدر طبقات نہ صرف یہ کہ وہ عام طور پر اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، بلکہ وہ داعی کو ہر طرح کی تکلیف اور اذیت پہنچانے کے لئے کوشاں رہتے ہیں، اس طرح کی صورت حال میں داعی کے لئے سب سے بڑا سہارا اللہ کا ذکر اور تسبیح ہے کہ اس سے دل میں اللہ کے انوار کا نزول ہوتا ہے، جس سے سکینت حاصل ہوتی ہے، اور داعی نئی توانائی کے ساتھ دعوت کے کام کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

جب کافروں کی الٹی سیدھی باتوں سے اللہ کے رسول اللہ ﷺ کے سینے میں تنگی کی حالت پیدا ہو جاتی تھی تو دوسرے داعیوں کو اس طرح کے حالات میں دلی اذیت کی جو حالت

پیدا ہو سکتی ہے، وہ ظاہر ہے، اس طرح ہر داعی کے لئے یہ نکتہ واضح فرمایا گیا کہ وہ اس طرح کے حالات میں اللہ کے ذکر و تسبیح کا زیادہ اور خصوصی اہتمام کرے۔

### اللہ کے نبی کو ذکر کی تاکید

إِذْ هَبْنَا نُبُّكَ يَا لُقَيْطِي وَلَا تَكُنِيَا فِي ذِكْرِي - (سورۃ طہ آیت ۴۲) (تو تم اور تمہارے بھائی میری آیتیں لے کر (فرعون) کے پاس جاؤ لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے ذکر سے غافل ہو)۔

اللہ کے جلیل القدر نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کے بھائی سمیت وقت کے سب سے مغرور انسان کے پاس پیغام پہنچانے کے غرض سے بھیجا جا رہا ہے، اس وقت ان کو جو تاکید کی جا رہی ہے وہ اپنے ذکر کے استحضار کی تاکید ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر ایسی چیز ہے جو سب کی ناگزیر ضرورت ہے، جو اللہ کی طرف سے جتنے بڑے منصب پر فائز ہے، اس کے لئے زیادہ ذکر کی ضرورت ہے، اس لئے کہ ذکر سے اللہ کی معیت ہونے کا احساس غالب ہوتا ہے، اس سے بڑے سے بڑے طاغوت کے مقابلے میں کھڑے ہونے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے، ذکر فرد کو اللہ کی راہ پر مستحکم کرتا ہے، جب اللہ کے جلیل القدر نبی و رسول کو ذکر کی تاکید ہے تو ہمیں تو اس کا مزید اہتمام کرنا چاہئے، اس لئے کہ نفس کافر عوں ہمارے ساتھ لگا ہوا ہے، اس فرعون کو مغلوب کرنے کے لئے اللہ کے ذکر کی طاقت مطلوب ہے۔

### دوران جنگ و جہاد بھی کثرت ذکر کی تاکید کا ہونا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقَيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ -  
(سورۃ الانفال آیت ۴۵) (اے ایمان والو، جب تمہارا کفار سے مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کا کثرت سے ذکر کرو تاکہ فلاح پاؤ)۔

## دنیا کی ساری زندگی کا

### ایک لمحہ کا ہونا

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُونَ مَا لَبِئُوا غَيَاةَ سَاعَةٍ (سورۃ الروم آیت ۵۵)

(جس روز قیامت برپا ہوگی (اس دن) گنہگار قسمیں اٹھائیں گے کہ ہم دنیا میں نہ رہے تھے مگر ایک گھڑی)۔

انسان کو یہ زندگی جو ملی ہے کہ ایک اعتبار سے تو وہ ساٹھ ستر سال تک پھیلی ہوئی ہے، دوسرے اعتبار سے جب وہ گزر جاتی ہے تو فرد پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ ساری زندگی ایک لمحہ یا چند لمحات سے زیادہ نہیں تھی، قیامت کے دن تو فرد اس ساٹھ ستر برس والی زندگی کے بارے میں قسم کھائے گا کہ میں دنیا میں نہ رہا تھا مگر ایک لمحہ۔

جب زندگی کی کل حیثیت چند لمحات سے زیادہ نہ ہو، اس زندگی کا مستقبل کیا ہے؟ لیکن لگ بھگ ہم میں سے ہر فرد چند لمحات والی زندگی کے مستقبل کے بارے میں حیران و پریشان ہے، اس کی ساری فکر مندی اور ساری سرگرمیاں اسی زندگی کو تابناک بنانے کے لئے ہیں۔

انسان کی یہ روش ایسی ہے جو دانشمندی کے سراسر منافی ہے، اصل زندگی تو آخرت کی ہے اور آخرت والی ابدی زندگی کے مستقبل کا انحصار چند لمحوں والی اسی زندگی پر ہے۔

اس نکتے کو نہ سمجھنے کی وجہ سے انسان ابدی زندگی کے ہولناک خسارے سے دوچار ہے، اللہ ہماری دل کی آنکھیں بیدار کر کے ہمیں ابدی زندگی کی تیاری کی فکر نصیب فرمائے۔

فتنوں کی روک تھام کے سلسلے میں کردار کی ادائیگی

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبُنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً وَلَا عَمَلُوا إِنَّ اللَّهَ هَدِيْدُ الْعَقَابِ۔

(سورۃ الانفال آیت ۲۵) (اس فتنے سے ڈرو جو (اگر برپا ہو گیا) تو وہ خصوصیت کے ساتھ

انہی لوگوں پر واقع نہ ہوگا، جنہوں نے تم میں سے ظلم کیا خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ سخت عذاب

دینے والا ہے)۔

اس آیت میں جہاد کی تاکید کے ساتھ عین جہاد کے موقع پر جو دوسری تاکید فرمائی گئی ہے، وہ ذکر کی تاکید ہے کہ اس وقت بھی کثرت سے اللہ کا ذکر ہو، یعنی جسمانی توانائی دشمن سے مقابلے میں صرف ہو تو دل اللہ کے طرف متوجہ ہو، اس آیت سے ذکر کی غیر معمولی اہمیت ثابت ہوتی ہے، چونکہ کفار سے مقابلے کے وقت نفسانیت کے اجزا شامل ہو سکتے ہیں، اس لئے جہاد کے وقت اخلاص کی اعلیٰ حالت پیدا کرنے کے لئے ذکر کی تاکید فرمائی گئی، ذکر کے ذریعہ اخلاص کی حالت اللہ کی مدد اپنے ساتھ لانے کا ذریعہ بنتی ہے۔

اللہ کی راہ میں جان قربان کرنا سب سے بڑی سعادت ہے اور یہ سعادت خوش نصیب افراد ہی کو حاصل ہوتی ہے، اس موقع پر بھی ذکر کی تاکید کرنا، یہ اس بات کی علامت ہے کہ ذکر سے اللہ کے دھیان کا غلبہ اللہ کو مطلوب ہے۔

حضرت علی کرم اللہ کا واقعہ ہے کہ انہوں نے جنگ میں ایک کافر کو زیر کر لیا تھا، کافر نے دیکھا کہ اب تو مرنا ہی ہے، انہوں نے حضرت علی کے چہرے پر تھوکا، آپ نے فوراً اس کو چھوڑ دیا، کافر نے پوچھا کہ یہ تو آپ کے لئے بڑا موقع تھا کہ آپ مجھے مارتے، آپ نے فرمایا، تمہارے تھوکنے کی وجہ سے مجھے یہ خطرہ نظر آیا کہ کہیں میرے اندر نفسانیت کے اجزاء شامل نہ ہوں کہ میں تمہیں اپنی ذات کو وجہ سے ماروں، پہلے تو میں خالص اللہ کے لئے لڑ رہا تھا، اب تمہارے تھوکنے کے بعد نفس کی حالت میں انتقام لینے کا تغیر پیدا ہو سکتا تھا، اس لئے میں نے تمہیں چھوڑ دیا، آپ کے اس رویے سے وہ کافر مسلمان ہوا۔

اس طرح جنگ کے دوران اعلیٰ درجے کے اخلاص کے لئے بھی اللہ کے ذکر کی ضرورت لاحق ہوتی ہے کہ ذکر اخلاص کی حالت کو مستحکم کرتا ہے۔

اس آیت میں اس فتنے سے ڈرایا گیا ہے جس کے اثرات فتنہ برپا کرنے والوں تک محدود نہ ہوں گے، بلکہ اس کی لپیٹ میں عام و خاص سب آجائیں گے، اس لئے قبل اس کے کہ وہ فتنہ برپا اور طاقتور ہو، اس فتنے کو اٹھتے ہی اس کی روک تھام کی کوشش کی جائے اور اس سلسلے میں اپنے حصہ کا کردار ادا کیا جائے، دوسری صورت میں سب اس کے اثرات کی زد میں آجائیں گے۔

یہ بہت اہم آیت ہے، جو ہر طرح کے فتنوں کی روک تھام کے سلسلے میں بندہ مومن کو اپنی وسعت کے مطابق اس کی روک تھام پر ابھارنے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

ہمارے ہاں نت نئے فتنے اٹھ رہے ہیں، بالخصوص نئی نسل فتنوں کی لپیٹ میں آرہی ہے، مذہبی خاندانوں کی نسلیں بھی ان فتنوں سے متاثر ہو کر سیرت و کردار کے بحران اور ذہنی خلفشار کا شکار ہو رہی ہیں۔

ایک بڑا فتنہ جو مغربی طرز زندگی اور طرز فکر سے اٹھا ہے، وہ سیکولر طرز زندگی کا فتنہ ہے، جس کے مطابق انفرادی زندگی میں تو مذہبی تعلیمات ٹھیک ہیں، لیکن معاشرت، معاملات، کاروبار، سیاست اور اجتماعی زندگی میں دین و مذہب سے آزاد سیکولر طرز زندگی اختیار کریں گے، مغربی قوموں کے ہاں پھر بھی قومی اخلاق اور کاروباری اخلاق کے نام سے کچھ اچھی چیزیں موجود ہیں، ہم ان سے بھی محروم ہیں، یہ سیکولر طرز زندگی کا فتنہ عام ہوا ہے، اس کی لپیٹ میں ہر طرح کے لوگ آگئے ہیں، جس کی وجہ سے ہماری معاشرتی اور اجتماعی زندگی خلفشار سے دوچار ہے، امانت و دیانت ختم ہو گئی ہے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان فتنوں کی روک تھام کے سلسلے میں اپنا کردار ادا نہ کرنے کی وجہ سے ہم اللہ کے شدید عتاب کا شکار ہیں۔

اللہ تعالیٰ فتنوں کے سلسلے میں ہمارے اندر حساسیت پیدا فرمائے اور ہمیں اپنے عتاب

سے بچائے۔

لوگوں کو نیکی کی تلقین کرنا، اپنے آپ کو فراموش کرنا

اَتَاْمُوْنَ النَّاسِ بِالْبِرِّ وَتَنَسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ۔ (سورۃ البقرہ آیت ۴۴) (تم لوگوں کو تو نیکی کرنے کو کہتے ہو اور اپنے آپ کو فراموش کر دیتے ہو)۔

جب ایمان و یقین کے حوالے سے دل پر محنت نہیں ہوتی تو فرد کی شخصیت میں تضادات پیدا ہو جاتے ہیں، وہ تضادات بے عملی کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، فرد نیکی کے سلسلے میں جانتا تو بہت کچھ ہے، لیکن یہ جاننا نہ جاننے کے برابر ہوتا ہے، اس لئے کہ بے حسی کی وجہ سے وہ عمل کی صلاحیت سے محروم ہو چکا ہے، البتہ دوسروں کی تلقین کے لئے اس کے پاس بہت ساری باتیں ہوتی ہیں، وہ خود عمل کی صلاحیت سے قاصر ہوتا ہے، جب کہ وہ دوسروں کو اصلاح کی دعوت دے رہا ہوتا ہے، وہ خود دنیا سے محبت کر رہا ہوتا ہے، دوسروں سے کہتا ہے کہ دنیا کی محبت ساری برائیوں کی جڑ ہے، وہ خود اخلاق سے محروم ہوتا ہے، جب کہ دوسروں کو اخلاق کی تعلیم دے رہا ہوتا ہے، اس آیت میں افراد معاشرہ کے تضاد کی اس حالت کی نشاندہی فرمائی گئی ہے، اور بالواسطہ طور پر قول و فعل کے تضاد سے بچنے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔

قیامت کے لئے کیا سامان بھیجا ہے، اس کی فکر کا ہونا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَارْتَقُوا أَنْفُسَكُمْ مَا قَدَّمْتُمْ لِغَدٍ۔ (سورۃ الحشر آیت ۱۸)  
(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص کو دیکھنا چاہئے کہ اس نے کل (قیامت) کے لئے کیا سامان بھیجا ہے)۔

اس آیت میں اللہ سے ڈرنے اور خود احتسابی پر زور دیا گیا ہے کہ اصل زندگی جو آخرت کی زندگی ہے، دیکھنا چاہئے کہ میں نے اس کے لئے کیا بھیجا ہے، اور اس کی تیاری کی فکر کتنی ہے، نیز ایسے اعمال جو آخرت میں مجھے کام آئیں گے، ان اعمال کی سرانجامی میں اس نے کس قدر مستعدی سے کام لیا ہے، خود احتسابی سے کام لے کر آخرت میں کام آنے والے اعمال کو

سرا انجام دینا، یہ ہماری فکر اور توانائیوں کا سب سے بڑا ہدف ہونا چاہئے، آخرت سے غفلت سب سے بڑے خسارے کی بات ہے۔

ہماری عام طور پر حالت یہ ہے کہ اول تو اعمال سرا انجام دینے میں غفلت و بے توجہی کا مظاہرہ کریں گے، اگر اعمال سرا انجام دیں گے بھی تو وہ اعمال اخلاص سے خالی ہوں گے، وہ اعمال برائے اعمال یا اعمال برائے عادت ہوتے ہیں، ان میں آخرت کا پوری طرح دھیان شامل نہیں ہوتا، اس آیت میں اس کی فکر مند پر توجہ دلائی گئی ہے۔

اللہ کی طرف سے بھلا دینے کا انتباہ

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ - (سورۃ الحشر آیت ۱۹) (ان

لوگوں جیسے نہ ہونا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے خود ان کو فراموش کر دیا (بھلا دیا)۔

اس آیت میں اس حقیقت کا اظہار فرمایا گیا ہے کہ جو اللہ کو بھلاتا ہے، اللہ اس کو بھلا دیتا ہے، یعنی جو خدا شناسی سے کام نہیں لیتا، اس سے خود شناسی کی صلاحیت سلب کر لی جاتی ہے اور اسے اللہ کے ذکر کی توفیق نصیب نہیں ہوتی، اللہ کے ذکر سے دوری اور محرومی کی کتنی بڑی سزا ہے کہ اسے بھلا دیا جاتا ہے، اور اس کی روح کو بھٹکتے رہنے کی حالت سے دوچار کر دیا جاتا ہے۔

انسانی روح کی تو خاصیت یہ ہے کہ وہ ذکر کے ذریعہ اللہ سے محبت کے ارتقائی مراحل طے کرے اور محبت میں مسلسل آگے بڑھتی رہے، یہ انسان کی اصل شخصیت یعنی روح کی اصل غذا ہے، انسان کو بھلا دینے کا مطلب یہ ہے کہ روح کو اس کی غذا سے محروم کیا جائے، جس سے وہ تڑپنے لگتی ہے، اس کی بے قراری کی حالت ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی، اللہ کو بھلا دینے کی یہ سزا معمولی سزا نہیں ہے، بہت بڑی سزا ہے۔

بُرَائِي کے بدلے میں بہتر کردار کے اثرات

إِذْفَعِ بِالْقِيِّهِ أَحْسَنُ قَادًا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ - (سورۃ حم سجدہ

آیت ۳۴) (بُرَائِي کا ہندراک اس نیکی سے کرو جو بہتر ہو تو اس سے تم دیکھو گے کہ جس میں اور تم میں دشمنی ہے گویا وہ تمہارا گرم جوش دوست ہے)۔

اس آیت میں بُرَائِي کے جواب میں احسان کا مظاہرہ کرنے اور بہتر کردار اور روش کے اثرات کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ اس سے بڑے سے بڑا مخالف شخص بھی زیر ہو کر گرم جوش ساتھی بن جائے گا۔

احسان کی روش اور بہتر کردار میں اس طرح کی خاصیت موجود ہے کہ اس کی وجہ سے دلوں کی تسخیر کا عمل شروع ہونے لگتا ہے کہ ایسے فرد کی لوگ دل سے عزت اور قدر کرنے لگ جاتے ہیں، اگر بُرَائِي کے جواب میں عفو و درگزر، محبت اور اعلیٰ کردار کا مظاہرہ ہو، اس سے مخالف کا دل متاثر ہو کر زیر نگین ہونے لگتا ہے، لیکن مخالف سے احسان کا معاملہ کرنا اور بُرَائِي کے بدلے میں اعلیٰ کردار اور ظرف کا مظاہرہ کرنا آسان کام نہیں ہے، اس کے لئے ایمان کی مستحکم حالت کا ہونا ضروری ہے، جو ذکر پر محنت کے نتیجے میں ہی پیدا ہو سکتی ہے۔

## طبِ مغرب میں روحانیت کا بڑھتا رہتا رجحان (بے خدارو حانیت)

ہر چیز کو عقل اور سائنس کی کسوٹی پر پرکھنے والے اہل مغرب گذشتہ چند دہائیوں سے فلسفہ اور منطق چھوڑ کر روحانیت کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ مشرق کے مشہور صوفی شاعر جلال الدین رومی پچھلے کئی برسوں سے امریکا اور یورپ میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے بدیسی شاعر بن چکے ہیں اور ان کے فلسفہ عشق کو نوجوانوں میں خاص پذیرائی مل رہی ہے۔ مغرب میں روحانیت پسندی میں اضافے کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں، مگر سب سے بڑی وجہ مغربی معاشرے میں اخلاقی اقدار کا زوال اور رشتوں کے بیچ بڑھتے فاصلے ہیں۔ مشینی زندگی اہل مغرب کو لطیف جذبات اور محسوسات سے بہت دور لے کر جا رہی ہے۔ وہاں انسانی وجود کو صرف نفع اور نقصان کے تناظر میں دیکھا جا رہا ہے۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ مغرب میں انسان ایک روبوٹ کی حیثیت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ جن کی روح کسی بھی قسم کی تازگی سے محروم ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے انسان کو بے پناہ طاقت سے نوازا، مگر یہ کسی بھی طرح انسانی روح کی تشنگی دور نہ کر سکی۔ ان تمام مسائل سے تنگ اہل مغرب ان کا حل روحانیت میں تلاش کر رہے ہیں۔

دنیا کے ہر مذہب میں معنی کے کچھ فرق کے ساتھ روحانیت کا تصور موجود ہے۔ علمائے کرام اور صوفیوں کے نزدیک روحانیت سے مراد قرب الہی کا حصول ہے، مگر یورپ اور امریکا میں روحانیت کا تعلق مذہب سے ہونا ضروری نہیں۔ "روحانیت سے نفسیاتی علاج" پر تحقیق کرنے والی ڈاکٹر مایا سپینسر کے مطابق "اپنے ارد گرد کے ماحول میں محبت، سچائی، ہم دردی اور

اچھائی تلاش کرنا روحانیت کہلاتا ہے۔" ایک اور محقق جمیس کا کہنا ہے "اپنے ارد گرد رہنے والے جان داروں کی اصل تک پہنچنا روحانیت کہلاتا ہے۔" یورپ اور امریکا میں گذشتہ کئی برسوں میں طب کے شعبے میں جس تیزی سے ترقی ہوئی وہ قابلِ قدر ہے۔ مختلف جان لیوا بیماریوں کے علاج کے لیے ادویات کی سائنسی بنیاد پر تیاریوں نے لوگوں کا سائنس پر اعتماد اور پختہ کر دیا، مگر اس کے باوجود مغرب میں طب کے شعبے میں روحانیت کو خاص اہمیت دی جا رہی ہے۔ امریکا میں طب کے شعبے سے منسلک ڈاکٹر کرشینا کے مطابق "طیب کا مقصد صرف مریض کی جسمانی حالت کی بہتری سے نہیں، بلکہ مریض کے دل میں بیماری کی وجہ سے پیدا شدہ منفی خیالات کا مکمل تدارک کرنا بھی اہم ہے، جس کے لیے ضروری ہے کہ مریض کو قدرت کی مہربانیوں اور نعمتوں کا احساس دلایا جائے۔" ڈاکٹر کرشینا کا یہ بھی کہنا ہے کہ "مریض میں موجود محبت، رحم، فیاضی اور تشکرانہ جذبات اُبھارنا مریض کو بیماری سے لڑنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔"

امریکا میں روحانی تربیت کے ذریعے ذہنی و جسمانی علاج پر تحقیق کرنے والے ایک ادارے سے وابستہ خاتون محقق ریچل ولیم کے مطابق "مریض کو روحانیت کی جانب مائل کرنا، ذہنی بیماریوں کے علاج میں تو ہمیشہ سے مددگار ثابت ہوا، مگر یہ جسمانی بیماریوں کے دفاع میں بھی بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق انسان کے جسم کا سارا نظام ایک بنیادی قانون توازن یا ترتیب پر انحصار کرتا ہے اور مذہب پسندی اور روحانیت پر عمل اس توازن کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ معروف شاعر چیکبست برنجر ان نے برسوں پہلے کیا خوب کہا تھا۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب  
موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشان ہونا

قدرت نے ہمارے اعضاء کو دفاعی نظام (Immune System) عطا کیا ہے، جو اس توازن کو برقرار رکھ کر ہمیں صحت مند رکھتا ہے، مگر جب کسی وجہ سے یہ نظام کمزور پڑ جاتا ہے، تو بیماریاں حملہ آور ہو جاتی ہیں۔ کیلی فورنیا یونیورسٹی میں بعض مریضوں کو، جن کا دفاعی نظام کمزور پڑ چکا تھا، روحانیت کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی گئی۔ انہیں کہا گیا کہ وہ دن کا کچھ حصہ چند مخصوص باتوں کے بارے میں سوچ بچار کریں۔ مثلاً اُن کی زندگی کا مقصد کیا ہے، نظام قدرت کون چلا رہا ہے، دوستوں رشتے داروں کے ساتھ ان کا سلوک کیسا ہونا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ چند عرصے بعد ایسے مریضوں پر دیگر مریضوں کی نسبت ادویات نے بہتر اثر کیا اور اُن کے اندرونی دفاعی نظام میں بہتری آئی۔

بلند فشار خون کو یورپ میں عوامی بیماری کہا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی یہ بیماری عام ہے۔ بلند فشار خون کا ایک اہم سبب ہماری عادات اور روزمرہ کے حالات ہیں، جو ہر روز مزید خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ جارج واشنگٹن یونیورسٹی کی ڈاکٹر کرٹینا بچلکسی کے مطابق ادویہ کے بعد ہائی بلڈ پریشر کا سب سے مؤثر علاج "دعا" ہے۔ دُعا ہر انسان کو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا سکھاتی ہے۔ مسلسل دعا کرنے والے اپنے متعدد مسائل کا حل اس مہربان ہستی کے سپرد کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر کرٹینا کے مطابق دعا کرنے والوں کا مالک کائنات پر اعتقاد زیادہ ہوتا ہے اور ان میں معاف اور محبت کرنے کا جذبہ بھی دیگر افراد سے کہیں زیادہ پایا جاتا ہے۔ یہی جذبات دل و دماغ کو پرسکون رکھتے ہیں اور پرسکون زندگی بلند فشار خون سے دور رکھتی ہے۔ بعض جان لیوا بیماریوں مثلاً سرطان، ایڈز یا پھر کسی دائمی معذوری میں مریض کی بہتری کے امکانات بہت کم، بلکہ نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ ایسے میں طبیب کی کوشش ہوتی ہے کہ مریض کی تکلیف کم سے کم کر کے اُسے اپنی باقی ماندہ زندگی ہمت اور حوصلے سے گزارنے کی تلقین کی جائے۔

کینسر کے مریضوں کو معلومات فراہم کرنے والی ایک بین الاقوامی تنظیم کے مطابق "کینسر میں مبتلا لوگوں کے دلوں میں خیال گھر کر لیتا ہے کہ اب اُن کی زندگی کم رہ گئی ہے اور وہ اپنی باقی بچی زندگی کسی صحتمند انسان کی طرح نہیں گزار سکتے۔ وہ یہ بھی سوچتے ہیں کہ قدرت نے اس مرض کے لیے اُن ہی کا انتخاب کیوں کیا۔ بعض اوقات وہ اس بیماری کو اپنے گناہوں کا عذاب سمجھنے لگتے ہیں۔ تاہم، ایک اچھا طبیب ان منفی خیالات کو تبدیل کر کے مریض کی صحت میں بہتری لاسکتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اہل مغرب ماہرین نفسیات کے علاوہ روحانی (Spiritual) ماہرین کا سہارا بھی لیتے ہیں، جو مریض کو لوگوں سے میل جول رکھنے، ان کے مسائل میں دلچسپی لینے اور صلہ رحمی جیسی عادات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، جس کے نتیجے میں مریض کی زندگی میں مایوسیوں کے اندھیرے چھٹنے لگتے ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق سال ۲۰۲۲ء میں ۱۲ کروڑ سے زائد بالغ افراد ذیابیطس میں مبتلا تھے۔ واضح رہے، ان میں ۱۸ سال سے کم افراد شامل نہیں۔ ذیابیطس میں کمی اور زیادتی کی ایک بڑی وجہ ذہنی وجہاتی کیفیت ہے، جب کہ شدید ذہنی تناؤ اس مرض پر اثر انداز ہوتا ہے، جس کے منفی اثرات گردوں سمیت دیگر جسمانی اعضا پر مرتب ہو سکتے ہیں۔ ۲۰۱۸ء میں یونان میں "ذیابیطس پر قابو رکھنے میں روحانیت کی اہمیت" کے عنوان پر ایک تحقیق کی گئی اور نتیجہ روحانیت کے حق میں آیا۔ مذہب اور روحانیت پر عمل کرنے والے افراد کھانے پینے سے لے کر روزمرہ کے دیگر معمولات میں اعتدال پسند ہوتے ہیں اور ذیابیطس کے مریضوں کے لیے سب سے اہم مشورہ بھی یہ ہی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اعتدال سے کام لیں۔ اس کے علاوہ نفسیاتی الجھنوں کے حل میں تو روحانیت کی اہمیت مستند ہے، مگر کئی ایسی نفسیاتی الجھنیں ہیں، جو پیچیدہ ہو کر جسمانی تکالیف کا سبب بنتی ہیں۔

## کتاب تہذیب و تمدن کی روشنی

کتاب الفاظ کے وہ چراغ ہیں جو صدیوں سے انسانی ذہنوں کو منور کرتے آ رہے ہیں۔ یہ صرف ایک کاغذی دستاویز نہیں بلکہ شعور، تہذیب، اخلاق، اور تحقیق کی وہ روشن قندیل ہے جس نے انسان کو جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر علم کے اجالے میں لاکھڑا کیا۔ 23 اپریل کو منایا جانے والا عالمی یوم کتاب ہمیں اس علمی ورثے کی یاد دلاتا ہے جو نسل در نسل منتقل ہوتا رہا ہے اور جس نے دنیا کی تاریخ کو بدلا ہے۔

اگر ہم علم اور کتاب کی قدر و منزلت کو سمجھنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں الکتاب یعنی قرآن مجید کو دیکھنا ہوگا، جو تمام علوم کی اصل ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جو نہ صرف انسانی زندگی کے ہر پہلو کی رہنمائی قرار دیتی ہے۔ قرآن مجید میں علم کے حصول کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے، چنانچہ پہلی وحی کا آغاز ہی **اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ** (پڑھ! اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا) سے ہوتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے بھی فرمایا: "علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔" (ابن ماجہ)

یہی وہ شعور تھا جو ائمہ کرام اور عظیم فلسفیوں نے اپنی تحریروں میں اجاگر کیا۔ امام غزالی، جنہیں حجتہ الاسلام کہا جاتا ہے، اپنی شہرہ آفاق کتاب "احیاء علوم الدین" میں فرماتے ہیں کہ: "علم ایک ایسا نور ہے جو قلب کو روشنی عطا کرتا ہے، اور جہالت وہ اندھیرا ہے

جو انسان کو بربادی کی طرف لے جاتا ہے۔" وہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی معاشرے میں علم اور کتاب سے تعلق ختم ہو جائے، تو وہ تباہی کے دہانے پر جا کھڑا ہوتا ہے۔

اس طرح ارسطو، جو مغربی فلسفے کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں، اپنی کتاب "میٹافزکس" میں کہتے ہیں: "انسان کی سب سے بڑی طاقت اس کا علم ہے، اور سب سے بڑی کمزوری اس کا جہل ہے۔" ان کے استاد سقراط کا قول تھا: "میں جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا، لیکن میرا یہی شعور مجھے دوسروں سے برتر بناتا ہے۔" یہی وہ ذہنی رویہ ہے جو کتاب کے ذریعے پروان چڑھتا ہے۔

اسلامی تہذیب میں، جہاں کتاب کو روحانی اور علمی ترقی کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھا گیا، وہیں آسمانی کتابوں نے بھی انسانیت کی رہنمائی میں بنیادی کردار ادا کیا۔ تورات، زبور، انجیل، اور پھر قرآن مجید ہر کتاب نے اپنے وقت کے لوگوں کو علم و حکمت کی روشنی فراہم کی۔ نبی اکرم ﷺ نے کتاب کے ذریعے علم کو عام کرنے کی حوصلہ افزائی فرمائی، یہاں تک کہ غزوہ بدر کے قیدیوں کو رہائی کے بدلے میں مسلمانوں کو تعلیم دینے کا حکم دیا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ ایک امت کی ترقی کا راز ہتھیاروں میں نہیں، بلکہ علم اور کتاب میں پوشیدہ ہے۔

آج جب ہم جدید دنیا کی طرف نظر ڈالتے ہیں، تو ہمیں شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کا علمی سرمایہ اس علمی روایت کا تسلسل نظر آتا ہے۔ انہوں نے ہزاروں موضوعات پر کتب تحریر کیں جو نہ صرف اسلامی تعلیمات بلکہ جدید دور کے فکری چیلنجز کا بھی احاطہ کرتی ہیں۔ ان کی تصانیف، جیسے "قرآنی انسائیکلو پیڈیا"، "سیرۃ الرسول ﷺ"، "اسلام میں

ہوں؟ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری آنے والی نسل فکری طور پر مضبوط ہو، تو ہمیں اپنا رشتہ کتاب سے جوڑنا ہوگا۔

آئیے، آج کے دن ایک وعدہ کریں کہ ہم کم از کم ہر ماہ ایک اچھی کتاب ضرور پڑھیں گے، اپنی لائبریری میں اضافہ کریں گے، اور اپنے دوستوں کو بھی اس علمی سفر میں شریک کریں گے۔ یہی وہ راستہ ہے جو ہمیں ایک مہذب، باوقار اور ترقی یافتہ قوم کی منزل تک لے جا سکتا ہے۔

انسانی حقوق، "المنہاج السوی"، اور "عرفان القرآن"، ہر اس طالب علم کے لیے ایک علمی خزانہ ہیں جو دین، فلسفہ، سائنس، اور اخلاقیات پر گہری نظر رکھنا چاہتا ہے۔

منہاج القرآن انٹرنیشنل کے تحت شائع ہونے والی یہ کتب صرف علمی ذخیرہ نہیں، بلکہ ایک فکری تحریک بھی ہیں جو نوجوان نسل کو تحقیق و تدبر کی راہ پر گامزن کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ، اگر ہم تاریخ کے دیگر عظیم مصنفین پر نظر ڈالیں تو امام ابن تیمیہ، علامہ ابن رشد، جابر بن حیان، الفارابی، ابن سینا، اور مولانا روم جیسے مفکرین کا علمی کام آج بھی دنیا بھر میں پڑھا جاتا ہے۔

کتاب دوستی کو اپنا کر ہی علم کی وسعت، فصاحت و بلاغت، تحمل و بردباری اور روشن خیالی کی منازل طے کی جاسکتی ہیں۔ جو قومیں مطالعے کی عادت ترک کر دیتی ہیں، وہ زوال کی گہری کھائی میں جا گرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ اقوام آج بھی کتب بینی کو اپنی ثقافت کا لازمی حصہ سمجھتی ہیں۔ وہاں کی لائبریریاں دن رات آباد رہتی ہیں، کتاب میلوں میں ہزاروں افراد شرکت کرتے ہیں، اور ہر گھر میں ذاتی کتب خانے بنائے جاتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں، بد قسمتی سے، یہ رجحان کمزور ہو چکا ہے۔ سوشل میڈیا اور ڈیجیٹل تفریح نے کتابوں سے رشتہ کمزور کر دیا ہے۔ لیکن ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ کیا ہم صرف سطحی معلومات اور فوری تفریح پر انحصار کر کے فکری طور پر مضبوط ہو سکتے ہیں؟ اگر نہیں، تو ہمیں دوبارہ کتاب کی طرف لوٹنا ہوگا۔

یہ دن ہمیں دعوت دیتا ہے کہ ہم اپنی زندگی میں مطالعے کو ایک لازمی عمل بنائیں۔ ہم خود سے سوال کریں: ہم نے آخری بار کون سی کتاب پڑھی تھی؟ کیا ہم اپنی نئی نسل کو کتابوں کی محبت منتقل کر رہے ہیں؟ کیا ہم نے اپنے گھروں میں ایسا ماحول بنایا ہے جہاں کتابیں عام

## جدید انسان کا سب سے بڑا مسئلہ تنہائی

ایک مغربی جامعہ میں ایک جماعت کے طلبہ سے پوچھا گیا کہ معاشرے کا بنیادی مسئلہ کیا ہے؟ سب نے ہی عام گھسے پٹے جواب دیے "خاندانی نظام کی ٹوٹ پھوٹ، ماحولی آلودگی، تشدد کا رجحان، جوہری جنگ، فرقہ واریت، نسلی، لسانی مذہبی نفرت وغیرہ۔" انہی طلبہ میں سے کسی نے کہا "تنہائی بھی مسئلہ ہے۔" پھر جب تمام طلبہ سے تنہائی کے متعلق رائے لی گئی، تو سب نے متفق الرائے ہو کر ہاتھ اٹھا دیے کہ اصل مسئلہ یہی ہے۔ اس واقعے کے بعد اس سے بڑی جماعت کے سامنے بھی یہی سوال لایا گیا کہ آج کا مسئلہ کیا ہے؟ سوائے ۲ طلبہ کے باقی سب متفق تھے کہ تنہائی ہی اصل مسئلہ ہے۔ سوال پوچھنے والے کے لیے بھی یہ بات باعث حیرت و دلچسپی تھی۔ مگر اسی وقت ایک دلچسپ صورت حال پیدا ہو گئی۔ نا تجرباً کے ایک طالب علم نے کہا "جب میں اول اول انگلستان آیا، تو میری سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ تنہائی کیا شے ہے۔ جب لوگ مجھے کہتے تھے کہ وہ تنہائی کا شکار ہیں، تو میں اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا کہ ان کا مطلب کیا ہے۔ ہماری تہذیب و تمدن میں تو تنہائی ہوتی ہی نہیں۔ ہماری زبان میں اس کے لیے کوئی لفظ بھی نہیں۔ ہر چند کہ وہاں امراض، تکالیف، رنج و غم، دکھ درد اور افلاس کی کثرت و شدت ہے، مگر تنہائی نہیں ہے۔ مگر پہلے انگلستان اور اب امریکا میں دو سال رہنے کے بعد میری اچھی طرح سمجھ میں آ گیا ہے کہ تنہائی کیا ہے۔"

جدید صنعتی و شہری معاشرہ سنگ و خشت و آہن سے بنا ہوا ایک بے جان کارخانہ ہے، جہاں لوگ ایک دوسرے سے بے پرواہ انسانوں کی طرح نہیں، بلکہ مشینوں کی طرح کام کرتے ہیں۔ اگر کوئی تعلق بھی ہے تو لاتعلقی کا۔ ایک جراح جو شفا خانہ باغ کستانی کے بانی اور

اب امریکا میں استخوان و مفاصل کی جراحی کرتے ہیں، چند احباب کے ساتھ کراچی میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے "میں جس قصبے میں ہوں، وہاں امریکیوں کے علاوہ پاکستانی اور ہندستانی بھی ہیں۔ اکثر افراد سے میں واقف ہوں۔ ہم ملتے بھی ہیں، گفتگو بھی ہوتی ہے، لیکن جس طرح بیٹھے ہوئے ہم یہاں باتیں کر رہے ہیں، امریکا میں نہیں کر سکتے۔ ہم وہاں مشین کے پرزوں کی طرح ہیں۔ ایک دوسرے سے رابطہ رکھے بغیر اپنے اپنے کام انجام دیے جاتے ہیں۔"

یہ تنہائی جو اہل مغرب میں عام تھی، اب مشرق کے بڑے شہروں کے باسیوں میں بھی دیکھی جا رہی ہے۔ گوا بھی تک دیہات، قصبات اور وسیع علاقائی و قبائلی برادریوں میں یہ مسئلہ نہیں بن سکی ہے، مگر جب یہ لوگ بڑے شہروں میں منتقل ہوتے ہیں، تو پھر انہیں یہ احساس ستاتا ہے کہ اس بھرے پرے شہر میں وہ کس قدر تنہا ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں ایک طبیب کا مشاہدہ تھا "بڑے شہروں میں برادری کے رشتے نقل مکانی اور معیار زندگی میں تفاوت کی وجہ سے ٹوٹ رہے ہیں۔ نئی آبادیوں میں باہمی میل جول نہ ہونے سے معاشرتی و سماجی تعلقات پیدا نہیں ہوئے، جس کی وجہ سے نفسیاتی پیچیدگیاں اور ذہنی کشمکش پیدا ہو رہی ہے۔"

لطیفہ (بنگم شائستہ اکرام اللہ کا بیان کردہ) "مرحوم غلام محمد اسمبلی میں میرے نزدیک سے گزر رہے تھے۔ میں لکھنے میں مصروف تھی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اردو میں "ایفنی شی اینسی" (صلاحیت کار) کے لیے کیا لفظ ہے؟ انہوں نے زہر خند سے جواب دیا "ایفنی شی اینسی" ہو تو لفظ بھی ہو، جب ایفنی شی اینسی ہے ہی نہیں، تو اس کے لیے لفظ کہاں سے آئے گا؟" چون کہ ابھی تک ہمارے یہاں تنہائی کی وہ صورت و شدت نہیں، جو مغرب میں ہے، اس لیے ہماری زبان میں اس کے لیے کوئی مناسب لفظ نہیں۔ جو بات انگریزی لفظ Loneliness میں ہے، اس کا ظہار اردو لفظ "تنہائی" سے نہیں ہو سکتا، نہ ہمارے یہاں پرائیویسی (Privacy-تخلیہ) کا صحیح تصور ہے کہ یہاں مغربی طرز کی پرائیویسی

ہے ہی نہیں، اس لیے اس کا بھی کوئی صحیح مترادف نہیں۔ تخلیہ سے وہ بات نہیں بنتی، جو پرائیویسی میں ہے۔"

اسی طرح ہم سیکولرزم (Secularism) اور فنڈامینٹلزم (Fundamentalism) کی صحیح ترجمانی "لادینیت" اور بنیاد پرستی" سے نہیں کر سکتے کہ ان الفاظ سے اہل مغرب جو کچھ مراد لیتے ہیں، اس طرح کی صورت حال ہمارے یہاں یک سر نہیں۔ ہر زبان اپنی تہذیب کی ترجمانی کرتی ہے اور بعض اوقات الفاظ کے مترادفات دوسری زبان میں مشکل سے ملتے ہیں۔ دراصل "احساس تنہا زدگی" (لون لی نیس) اور "تنہائی" دو مختلف صورتیں اور کیفیتیں ہیں۔ تنہا زدگی کا مطلب ہے کہ آپ تنہا رہنے پر مجبور ہیں، کوئی آپ کی فکر نہیں کرتا اور آپ کسی کی فکر نہیں کرتے، جو غیر فطری اور غیر انسانی ہے۔ آپ ہزاروں کے مجمع میں بھی تنہا زدگی میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ احساس تنہا زدگی مختلف صورتوں اور راستوں سے در آتا ہے یعنی ہم اپنے آپ، اپنے احساسات، دوسروں اور قادر مطلق سے لا تعلق ہو جائیں۔ یعنی صرف ایک دوسرے سے ہی بیگانہ اور افتادہ نہ ہو جائیں، بلکہ ایسی قوت اور ہستی سے بھی دور ہو جائیں، جو لوگوں کو پوسٹر رکھ کر توازن دیتی ہے۔ یعنی "پوسٹر رہ شجر سے امید بہا رکھ" والی کیفیت نہیں رہتی اور ہم مکمل طور پر تنہا تعلق ہو کر اندرونی امن چین سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس تنہائی درست اور مثبت ہے، جس میں آپ اپنے دل سے گفتگو کر سکتے ہیں۔ اپنے معبود اور اپنے ضمیر سے مخاطب ہو سکتے ہیں اور کبھی بھی لا تعلق نہیں ہوتے۔ بقول ایک روشن ضمیر صوفی "میں تنہا بھی ہوں، تو خوش رہتا ہوں۔ اگر لوگوں کے ساتھ بھی ہوں، تو خوش ہوتا ہوں۔" بعض صوفیہ اور سادھو ہمالیہ کے غاروں میں تنہا زندگی گزارتے ہیں، جہاں ان کے ساتھ چند پرندے ہوتے ہیں، مگر اس کے باوجود دوانسانوں اور انسانیت کے بہت قریب ہوتے ہیں۔

"میں ۵۴ سال کا ہوں اور میرے مورثے (جنین) ۱۰ لاکھ سال قدیم ہیں۔ سال ہا سال سے بچے کو زندہ رہنے کے لیے قبیلہ و برادری اور معاشرے کی توقعات و آداب کو سمجھنے اور بغیر کسی پس و پیش کے ماننے کی ضرورت تھی۔ ان پر یہ واضح کر دیا جاتا تھا کہ اگر انہوں نے اس ضمن میں کوئی سرتابی کی یا غلط وقت پر شور و غل کیا یا غلط اقدامات کیے، تو نہ صرف بچہ زندہ نہیں رہے گا، بلکہ قبیلہ و برادری بھی نیست و نابود ہو جائیں گے۔ یعنی بچے ایسے حالات کے ساتھ پیدا ہوتے تھے، جو ان پر پابندیاں اور قد عنینیں عائد کرتے تھے، تاکہ وہ اجتماعی توقعات و آداب پر پورے آئیں۔" (ایک مغربی طبیب)۔

اس تصور میں پیچیدگی اور گراہی جمہوریتوں کے ارتقا کے ساتھ (جو صرف ۴ ہزار سال قدیم ہیں) واقع ہوئی۔ فرد کی اہمیت پر مزید زور و تقویت یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی زمانے میں ہوئی، جو یورپ اور تازہ نیا دنیا کا اظہار تھا۔ اس کا انتہائی فروغ و عروج امریکا میں ہوا۔ امریکا کے انانیت پسند معاشرے نے اسے دل و جان سے قبول کر لیا، کیوں کہ امریکی نوآباد کار زیادہ تر تنہائی پسند اور مادر وطن سے فراری تھے۔ پھر یہ طریق زندگی مغربی طور طریقوں کے ساتھ دنیا کی دیگر آبادیوں میں بھی پہنچ گیا، حالانکہ وہاں ایک اجنبی نظریہ تھا۔

مغربی علم النفس نے ۱۶۰۰ء سے فرد کو مزید اہمیت دینا شروع کی ہے اور انفرادیت کو اُجاگر کیا ہے۔ ماہر نفسیات فرائڈ نے فرد کو اہم قرار دے کر خاندان کو نظر انداز کیا ہے، بلکہ بعض خامیوں اور خرابیوں کے لیے خاندان کو قصور وار ٹھہرایا ہے۔ جدید علم النفس کے مطابق انحصار و تعلق مرضیاتی ہے۔ تن درست و صحت مند وہ ہے، جسے کسی کی ضرورت نہیں۔ مغربی اقتصادیات و مذہبیات میں بھی فرد کی اہمیت زیادہ ہے۔ قبیلے کے بجائے فرد کی انفرادیت پر زور دے کر گروہ سے پچھڑے ہوئے فرد کی علیحدگی کو مزید شدید اور علیحدہ علیحدہ کر کے یہ احساس دلایا ہے کہ وہ تنہا ہیں۔

ایک ہی مٹی سے بنے ہوئے اور حضرت آدم کی اولاد ہیں۔ بڑا وہ ہے، جو اپنے معاملات میں وسیع الظرف اور اپنے رویے میں وسیع القلب ہے۔

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انسان کو  
 اخوت کا بیباں ہو جاہ محبت کی زباں ہو جا  
 یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی  
 تو اے شرمندہ ساحل! اچھل کر بے کراں ہو جا  
 غبار آلودہ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے  
 تو اے مرغ حرم! اڑنے سے پہلے پر فشاں ہو جا

زمانہ انسان میں نہ خوف خدا ہے، نہ فکر آخرت۔ انسان جسے درد دل کے واسطے پیدا کیا گیا ہے، آج دوسرے انسان کے کام نہیں آتا۔ بے یار و مددگار لوگوں کا سہارا نہیں بنتا۔ مرنے کی آرزو میں زندہ رہنے والے بوڑھوں کو دلاسا نہیں دے سکتا۔ بھوک، بیماری اور جہل کے اندھیرے دور نہیں کر سکتا۔ صدیوں سے ظلم سہتے انسانوں کو ظالموں سے نجات نہیں دلا سکتا کہ جس ثقافت میں ہم جی رہے ہیں اس میں اصل اہمیت قاضی الحاجات (زر) کی ہے۔ آج کے لوگوں کے لیے کتاب مقدمہ 'بک' ہے۔ مغرب میں لوگوں سے لاتعلقی، بے گانگی اور خود غرضی آج کی بات نہیں۔ ٹی ایس ایلٹی کی نظم میں ہے، "تم ایک دوسرے کے ساتھ کیا اس لیے رہتے ہو کہ آپس میں محبت ہے؟ اس کا کیا جواب دو گے؟ ہم ایک دوسرے کے ساتھ اس لیے رہتے ہیں، تاکہ ایک دوسرے سے اور زیادہ فائدہ اٹھائیں، بلکہ پیسا بنائیں۔" لوگوں کو درجوں اور طبقوں میں تقسیم کرنے، ایک دوسرے سے مختلف سمجھنے، اختلافات کے جنجال میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ ماہر نفسیات یونگ کے مطابق تمام

بد قسمتی سے تہذیب جدید کی کرشمہ کاریوں نے ہماری ایک سانیوں سے چشم پوشی کر کے ہمارے اختلاف و فروق کو ہوا دی ہے اور جدید معاشرے کو نرگسیت (Narcissism) میں مبتلا کیا ہے۔ اب ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ دوسرے کی طرح دکھائی دے اور برتاؤ کرے، تاکہ لوگوں کو یہ علم نہ ہو کہ وہ ان سے متعلق نہیں حالاں کہ واقعہ یہی ہے کہ وہ متعلق نہیں اور کچھڑے ہوئے ہیں۔ ایک متناقض کیفیت یہ بھی ہے کہ ہم خوش ہونے کے لیے دوسروں سے مختلف اور علیحدہ ہونا چاہتے ہیں۔ دراصل، ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ خود کو علیحدہ کر کے خاص بنا کر اپنے فروق ظاہر کر کے خوش، قانع اور مطمئن ہو جائیں گے۔

خود غرضی، انفرادیت، تنہا زندگی کلبیت اور لاتعلقی کے فطری اور معمول کے مطابق (نارمل) نہیں (کیوں کہ ہم سماجی ہستیاں ہیں) اور ان کا اثر قوی بھی نہیں۔ اگر یہ قوی ہوتے، تو کرہ ارض پر لوگوں کی آبادی اس قدر گھنی ہر گز نہ ہوتی۔ اس طرح کا طرز عمل ہمارے اسلاف کا نہیں تھا، مگر اب صورتحال یہ ہو گئی ہے کہ ہر شخص کو صرف اپنے آپ سے غرض ہے اور خود کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ ہماری یہ عادت ہو گئی ہے کہ ہم لوگوں کو ان کی نسل، جنس، رنگ، زبان، مسلک، معاشرتی رتبے، اقتصادی حیثیت اور رہائشی معیار کے لحاظ سے دیکھتے ہیں۔ ہوش کی عمر آنے سے پہلے ہی ہمیں یہ سکھایا جاتا ہے کہ وہ عرب ہے، ترک ہے، سید ہے، شیخ ہے، سفید ہے، سیاہ فام ہے، اعلیٰ ذات کا ہے، ادنا ذات کا ہے، راجپوت ہے، بنیا ہے، برہمن ہے، پلچھ ہے، اچھوت ہے (حالاں کہ یہ فرق شناخت کے لیے ہیں۔ فوقیت کے لیے نہیں)۔

ہر چند کہ ہم فطرت صالحہ پر پیدا ہوتے ہیں، مگر پھر خود کو فرقوں، ذاتوں اور قومیتوں میں تقسیم کر لیتے ہیں، حالاں کہ عرب کو عجم پر اور گورے کو کالے پر فضیلت نہیں کہ دونوں

دفاعی حصار اور حفاظتی دیواریں جو ہم نے اپنے گرد و پیش کھڑی کر لی ہیں، اپنے اثرات میں سخت پابندیاں اور ظالمانہ انداز سے دبانے والی ہیں۔

لا تعلق لقیط (دھتکارے ہوئے) میں کسی سے خستگی میں داد پانے کی توقع نہیں ہوتی۔ ان کی طرف توانائی کا دھارا رک جاتا ہے۔ اس طرز عمل کے اثرات متضاد، خراب اور مضر ہوتے ہیں۔ خود بھی مصیبت میں رہتے ہیں اور دوسرے کو بھی مصیبت میں رکھتے ہیں۔ یہ الم ناک صورت حال ہے کہ جس تکلیف کا مداوا تلاش کیا تھا، وہ ہمیں مزید تنہا، معاشرے سے بے گناہ، بد حال، باہمی طور پر تلخ اور بے زار کر دیتا ہے۔ اگر ہم خود غرضی سے صرف اپنے ہی فائدے کے لیے کام کرتے رہے، تو نہ صرف دوسروں کو بلکہ اپنے آپ کو بھی ضرر پہنچاتے رہیں گے۔ سماج سے بعد یادوری کا اندازہ بعض حالات سے لگایا جاسکتا ہے۔ اکثر لوگ اب اس جگہ نہیں رہتے، جہاں پیدا ہوئے ہیں۔ اب ان کے ہمسائے مختلف ہیں۔ اب اس مسجد میں نہیں جاتے، جہاں بچپن اور نوجوانی میں جاتے تھے۔ اب وہاں کام نہیں کرتے، جہاں پہلے کرتے تھے۔ اپنے خاندان، برادری کے افراد اور قدیم احباب سے بھی قریبی تعلقات نہیں یا ملنے کے مواقع کم ملتے ہیں۔ کسی گزرے ہوئے اچھے زمانے میں محلہ بھی تعلقات کی آماج گاہ ہوتا تھا، جہاں آپ اکثر لوگوں کو جانتے تھے اور وہ آپ سے واقف ہوتے تھے۔ بعض اوقات یہ شناسائی کئی نسلوں پر محیط ہوتی تھی، جہاں آپ سب سے مانوس ہوتے تھے، جس سے ایک احساس آسودگی و تحفظ حاصل ہوتا تھا اور ان کا تعلق ہماری صحت و علالت سے اہم ہے۔ اب صورت حال ایسی تبدیل ہوئی ہے کہ آپ برابر میں رہنے والے کو بھی مشکل سے جانتے ہیں۔

نہ کنایہ نہ اشارہ نہ تبسم نہ کلام  
پاس بیٹھے ہیں مگر دور نظر آتے ہیں

سماجی اور باہمی تعلقات جاننے کے لیے یہ پوچھا جاتا ہے کہ کیا وہ شادی شدہ ہیں، دوسرے لوگوں سے کتنی دفعہ ملتے ہیں، کسی عبادت گاہ میں جاتے ہیں، جہاں لوگوں سے ارادہ یا بلا ارادہ ملاقات کرتے ہیں یا کسی ادارے میں شرکت کرتے ہیں۔ آپ اپنے دل سے پوچھیں کہ اگر آپ پیار پڑ جائیں، تو کوئی آپ کا دوست ہے، جو آپ کو شفا خانے لے جائے گا یا آپ کو نقالہ (ایمبولینس) یا سیارہ (ٹیکسی) منگانا پڑے گی۔ اگر آپ ضرور تمند ہیں، تو کوئی آپ کو قرض دے سکے گا۔ آپ کی بیماری کی کیفیت میں کوئی آپ کے بچوں کی دیکھ بھال کرنے والا ہے۔ یعنی کوئی ایسی ہستی ہے، جو واقعی آپ کا خیال کرتی ہے، آپ سے محنت کرتی ہے، خود کو آپ سے قریب محسوس کرتی ہے اور آپ کی مدد کرنا چاہتی ہے، جس کے ساتھ آپ دل کی باتیں کرنا چاہتے ہوں اور کر سکتے ہوں۔

یہ سب باتیں آج سے چند عشرے پہلے عام تھیں، مگر اب عنقا ہوتی جا رہی ہیں، اگر ان سب کے جوابات "نہیں" میں ہیں، تو آپ کے لیے مختلف امراض میں مبتلا ہونے اور قبل از وقت موت کا امکان ۳ سے ۵ گنا، بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے۔

## صحت کو بگاڑنے میں

### نفرت، بغض اور کینہ جیسی برائیوں کا کردار

توانائی فراہم کرتا ہے، ہمیں مکمل طور پر پرسکون عطا کرتا ہو اور تناؤ سے دور رکھتا ہے، ہم جذباتی طور پر متوازن رہتے ہیں اور جب تک ہم جذباتی طور پر متوازن رہیں، ہماری توانائی میں کمی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ہماری جسمانی ساخت اس نوعیت کی ہے کہ عمومی غذائی عادات کی مدد سے توانائیاں زیادہ سے زیادہ جمع ہو سکتی ہیں۔ مناسب ورزش، اچھی خوراک، پرسکون نیند، تناؤ، نشہ آور اشیا اور دیگر غیر صحتمند رویوں سے دوری ہماری صحت برقرار رکھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

صحتمند رہنے کے لیے منفی جذبوں سے خود کو دور کر لیں۔ یاد رکھیے جو لوگ نفرت، خوف، حسد، بے اعتمادی، بغض و کینہ اور لالچ جیسے منفی جذبات کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں، ان کے لیے نہ تو دن پرسکون ہوتے ہیں، نہ ہی آرام دہ نیند ان کا مقدر ہوتی ہے۔ یہ بات گرہ سے باندھ لیں کہ نفرت اور آرزوگی دونوں ہی ذہن کے لیے زہر قاتل ہیں۔ ان بیمار خیالات کو ذہن میں جگہ نہ دیں۔ ہمارا ذہن ایک کارخانہ افکار ہے، جو وہی فراہم کرتا ہے، جو ہم طلب کرتے ہیں۔ ہمارے افکار تخلیقی ہونے چاہئیں۔ دراصل، ہم دوسروں کے لیے جو اچھا یا بُرا سوچتے ہیں، کل وہی ہمارے مقابل ہوتا ہے، لہذا ہمیشہ اچھا سوچیں۔ ناراضگی ایک زہر کے مانند ہے جو آہستگی سے بیمار کر دیتی ہے۔ یہ سکون کی حالت کی دشمن ہے اور اپنے اسیر کو تناؤ کا شکار بنا دیتی ہے۔ کشادہ دلی سے کام لیں۔ اگر آپ کسی سے ناراض ہیں، تو اسے معاف کر دیں۔ یہ شیریں ترین طرز عمل بہترین انسانی روابط کی کنجی ہے۔ ہمیں کوئی دوسرا تکلیف اور پریشانی میں مبتلا نہیں کر سکتا۔ یہ ہمارے اپنے انداز فکر پر منحصر ہے اور اس پر کہ ہم دوسروں کے لیے کیا کرتے ہیں۔ اچھائی، رحم دلی اور خلوص کو دوسروں تک پہنچائیں، کل ان کی دگنی تعداد ہمارے ساتھ ہوگی۔

صحتمند رہنے کے لیے ہر فرد عملی طور پر ایسے اقدامات کرے، جو بیماری کی طرف جانے سے روکتے ہیں۔ اعداد و شمار ثابت کرتے ہیں کہ بہت کم افراد طویل العمری کے باعث قدرتی

ہماری کامیابی اور خوشحالی ہماری اچھی صحت کے ساتھ مشروط ہوتی ہے، ماسوائے چند استثناء کے تمام کامیاب افراد نہ صرف جسمانی صحت، بلکہ ذہنی صحت کا خیال رکھتے ہیں۔ صحتمندی ایک ایسی کیفیت کا نام ہے، جو بہت محنت، خود اعتمادی، عمدہ خوراک کے انتہائی متوازن اور دانش مندانہ امتزاج سے حاصل ہوتی ہے۔ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کے مطابق صحتمندی صرف بیماری سے دوری نہیں، بلکہ نفسیاتی معاشی اور معاشرتی طور پر متوازن رہنے کا نام ہے۔ عظیم ارادوں کی بنیاد مضبوط اور توانا جسم ہی پر رکھنا ممکن ہے۔ ہم خود کو جس طرح محسوس کرتے ہیں، ہمارا جسم اس کے مطابق رد عمل دکھاتا ہے۔ اگر ہم خود کو تھکا ہوا محسوس کریں، تو تمکن کے اثرات جسم پر ظاہر ہوتے ہیں۔ خود کو صحتمند سمجھنے سے ہمارے جسم پر مثبت اثرات ہوتے ہیں۔ ہمارے اعصاب اور عضلات ہمارے ذہن کا فیصلہ تسلیم کرتے ہیں۔

بلاشبہ تن درست رہنا ایک محنت طلب کام ہے، جس کے لیے سب سے پہلے اپنے ذہن میں تندرستی سے متعلق مثبت انداز سے سوچیں، مذہب کے بتائے ہوئے راستے اپنائیں۔ دین اسلام نے ہمیں صحت برقرار رکھنے کے لیے بہترین اصول دیئے ہیں۔ صبح سویرے اٹھنا، نماز کی ادائیگی اور رات جلد سونا صحت کے لیے ٹانگ کا کام دیتی ہے۔ دن میں پانچ بار وضو اور مسواک کرنا صفائی کے اعلیٰ ترین معیار ہیں۔ خالق سے مسائل کے بارے میں مدد کی درخواست کرنا، دشواریوں کے مقابلے میں توانائی مانگنا ہمارے یقین میں اضافہ کرتا ہے۔ اس یقین کی مدد سے کہ اللہ تعالیٰ سے مہربان کوئی اور نہیں، جو ہماری فریاد پر لبیک کہتا اور فوری

موت کی بنا پر انتقال کرتے ہیں۔ اکثر وہ لوگ عالم شباب میں خرابی صحت کے سبب لقمہ اجل بنتے ہیں، جو صحت سے متعلق غلط رجحان رکھتے ہیں، اوقات پر کھانا نہیں کھاتے یا غذائی اجزا میں توازن نہ رکھنے کے سبب بیماریوں کے شکار ہوتے ہیں۔ چکنائی کا غیر ضروری استعمال عارضہ قلب کو جنم دیتا ہے، غلط اوقات پر کھانے سے نظام ہاضمہ خراب ہوتا ہے، منشیات کے استعمال سے جگر کی بیماریاں لاحق ہوتی ہیں، پان کٹکے اور اس جیسی اشیاء منہ کے سرطان کا سبب بنتی ہیں، تمباکو کے استعمال سے سینے اور سرطان کا مرض لاحق ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ وہ افراد جو خود کو وقت کی کمی کا شکار سمجھتے ہیں، ایک وقت میں ایک سے زائد کام کرنا چاہتے ہیں، صبح ناشتہ کرتے ہوئے اخبار بینی ان کی عادت ہوتی ہے، وہ خود کو غیر ضروری تناؤ کا شکار کر لیتے ہیں۔ وہ درست طریقے سے اخبار پڑھ سکتے ہیں، نہ ہی ناشتے سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ ایک وقت میں ایک کام مکمل ارتکاز کے ساتھ خوش دلی سے کریں۔ اس طرح ہم تھکن سے دور اور جسمانی ذہنی اور جذباتی طور پر صحت مند رہیں گے۔ صحت مند رہنے کے لیے خوراک پر مکمل توجہ دیں۔ ایسی خوراک استعمال کریں، جو غذائی اجزا کے لحاظ سے متوازن ہو۔ یعنی اس میں مناسب نشاستہ، چکنائی، لحمیات، نمکیات اور حیاتین شامل ہوں۔ مقدار خواہ کم ہو یا زائد، لیکن اس میں جسمانی ساخت اور کام کے لحاظ سے توانائی کی مناسب مقدار ہونی چاہیے۔ اسی طرح صبح کا ناشتا بھی انتہائی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ مناسب وقفے کے بعد تقریباً گیارہ بجے کوئی ہلکی پھلکی شے ضرور کھائیں۔ اس سے نہ صرف غذائیت بہتر ہوگی، بلکہ یہ وقفہ نئے سرے سے توانائی فراہم کرنے کا موجب بھی بنے گا۔ دوپہر کے کھانے کے ساتھ مناسب سلاڈ کا استعمال ضرور کریں۔

سلاڈ آنتوں کی حرکات کو متوازن رکھتا ہے۔ شام کی چائے اور رات کا کھانا مناسب وقفہ سے کھائیں۔ چائے کے ساتھ ایک آدھ بسکٹ کا استعمال معدے کی تیزابیت سے محفوظ رکھتا ہے۔ خوراک کے بارے میں ایک بات بہت ضروری ہے کہ خوراک کی صرف اتنی ہی مقدار

استعمال کریں، جو ضروری ہو، کیوں کہ ہمیں زندہ رہنے کے لیے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے، خوراک کے لیے زندہ رہنے کی نہیں۔ اپنی توانائی کے بے جا اسراف سے خود کو دور رکھیں۔ خود کو غیر ضروری مشقت میں نہ ڈالیں۔ اگر بیٹھنے کا موقع حاصل ہو، تو کھڑے نہ ہوں، سونے کا وقت ہو، تو جاگیں نہیں، اپنی تیزی کو آہستگی میں تبدیل کر دیں، یہ عمل تھکن اور بیماریوں سے دور کر دے گا۔ اگر بیماری یا تھکن کی کیفیت میں کوئی کام شروع کیا جائے، تو گویا آپ نے خود کو ایسا جرنل سمجھ لیا ہے، جو بغیر اسلحے کے جنگ شروع کر دے۔ یہ تو سراسر ناکامی کے راستے ہیں۔ تھکن سے خود کو دور رکھیں، خواہ اس کے لیے آپ کو کئی کام التوا میں ڈالنے پڑیں۔ کوشش کریں کہ ہر وقت تازہ دم رہیں، جو صحت مند کی داد و سہرا نام ہے۔

بیمار ہونا ایک عام فہم طرز عمل نہیں، بلکہ ایک گمبھیر مسئلہ ہے۔ یہ ہمارے انداز فکر اور زندگی گزارنے کے طریقوں کی ترجمانی کرتا ہے، جس کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہے کہ ہم زندگی گزارنے کے حقیقی فطری اور قدرتی دھارے کے مخالف سمت میں چل رہے ہیں اور منفی طریقوں کا سہارا لے رہے ہیں، نہ صرف عمل میں بلکہ اپنے انداز فکر میں بھی۔ مضر صحت اشیاء مثلاً منشیات وغیرہ کا استعمال منفی انداز ہے اور زندگی کے قدرتی قانون نشوونما کا مخالف بھی۔ قانون نشوونما کی تائید تمام قوانین فطرت کرتے ہیں اور خاموشی، سکون اور تسلسل کے ساتھ اس کے اظہار پر عمل پیرا ہیں کیوں کہ جہاں اظہار اور افزائش ہے، وہاں زندگی ہے، جہاں زندگی ہے، وہاں ہم آہنگی ہے اور جہاں ہم آہنگی ہے، وہاں شان دار صحت ہے خوشیاں ہیں۔ اگر ہمارے خیالات اور ذہنی دھاروں میں موجود تخلیقی اصول ہم آہنگ ہیں، تو ہم یقیناً سرچشمہ ہم آہنگی کے ساتھ شاہراہ حیات پر سفر کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس اگر ہم ان اصولوں میں اور ان تصورات میں گھرے ہوں، جو ہم آہنگی کے مخالف یا ان سے ٹکرا رہے ہوں یا پریشان کن خیالات خوف زدہ کرتے ہوں، تو اس کا نتیجہ بیماری کی صورت نکلتا ہے۔

اکثر افراد اپنے ذہن میں بیماری اور کمزوری کو بٹھا رکھتے ہیں۔ خود پر مسلسل توجہ دیتے ہیں اور اسی فکر سے خود کو بیمار کر بیٹھتے ہیں۔ جب کبھی دل میں بیماری کے منفی خیالات آئیں، فوراً ہی مثبت پہلو پر دھیان دیں۔

ہر وقت صحت سے متعلق منفی سوچنے کے عمل میں ہماری توانائی کا اسراف ہوتا ہے۔ چہرے پر فکر مندی کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں اور ذہن تناؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لیے غیر ضروری سوچنے کے عمل کو بند کریں اور خود کو ذہنی کفایت شعاری کا عادی بنا لیں۔ بہتر ذہنی صحت کے لیے دن میں چند بار مناسب وقفہ سے دھرائیں، " میں نفرت نہیں کرتا، میں سب سے محبت کرتا ہوں، مجھے خوف سے کیا واسطہ، جب اللہ میرے ساتھ ہے، میں حسد کیوں کروں، جب اللہ نے مجھے ہر نعمت سے نوازا ہے۔ " ان جملوں کو بار بار دہرانے سے آپ میں غیر محسوس انداز سے ایک مثبت تبدیلی آئے گی، توانائی بحال ہوگی۔ اس طرح ذہنی صحت کا توازن بہتر ہوگا، جو آپ کو جسمانی توانائی فراہم کرے گا۔

بیمار ہونے کی صورت میں حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کریں۔ مطلب یہ کہ علاج میں تاخیر کر کے اپنی مدافعتی قوتیں نہ آزمائی جائیں، بلکہ فوری طور پر تجربہ کار ڈاکٹر سے رابطہ کریں، نیز علاج میں مکمل تعاون بھی کریں۔ ادویہ تجویز کردہ اوقات پر استعمال کی جائیں۔ اگر کوئی پرہیز ہے، تو لازماً کریں۔ اگر معالج آرام کا مشورہ دے، تو آرام کریں، بیماری کی حالت میں کام بیماری میں اضافہ، بلکہ پیچیدگیوں کا بھی سبب بن سکتا ہے۔ بیماری کی نوعیت کیسی ہی کیوں نہ ہو (ہلکی، درمیانی یا شدید)، اسے سنجیدگی سے لیں۔ تیمارداری کے لیے آنے والوں کے مشورے ضرور سنیں، لیکن علاج کے معاملے میں ان کے مشوروں پر عمل نہ کریں۔ ڈاکٹر مرض کو جانتا ہے، اسے علاج کرنے دیں۔ غیر ضروری کاموں اور عادات سے گریز کریں، جو طاقت اور قوت ضائع کرتے ہیں۔ اپنی قوت کو بے سود خرچ کرنا یا مسلسل کام کرنا بیمار کر دیتا ہے۔ اگر ہم اپنی عادات یا جذباتی تناؤ کی بنا پر اپنی توانائی ضائع کر دیں گے، تو بحالہ ہماری صحت متاثر ہو جائے گی۔ اپنے حالات پر مطمئن رہنا صحت کے لیے بہترین زاد راہ ہے۔ موجودہ تیز رفتار زمانے میں ہم نے مادی آسائشیں حاصل کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے اور غیر مطمئن رہ کر اپنی صحت کے توازن کو بگاڑنے کا سبب بن رہے ہیں۔ اپنے انداز میں تبدیلی لائیں، مطمئن رہیں، قناعت کریں۔

وہ واحد طریقہ، جو ہمیں صحت مندی کی جانب گامزن رکھتا ہے، وہ ہے "یقین"، جو ہمارے اندر موجود ہے۔ اس یقین کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارا ذہن ان خیالات پر رد عمل ظاہر کرتا ہے، جو ہمارے اندر موجود ہوں، خواہ وہ مثبت ہوں یا منفی، اچھی سوچ ہو یا بُری، ہمیشہ خود کو یہ یقین دلاتے رہیں کہ ہماری صحت کی طاقت خود ہمارے لاشعور میں موجود ہے، یقین زمین میں بویا جانے والا ایک علاج ہے، جو اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ تیزی سے بڑھتا ہے۔ صحت مند رہنے کے لیے ہر گھڑی اپنے ذہن میں تندرستی کے خیالات رکھیں۔ صحت اور تندرستی کا سوال ایک اخلاقی اہمیت کا سوال ہے۔ غیر اخلاقی طرز عمل ہمیں بیمار کر دیتا ہے۔

## ذہانت اقسام، تعیین، طریقہ استعمال

ذہانت کی تقریباً بارہ قسمیں ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

حسابی و منطقی ذہانت logical mathematical intelligence  
ان کے اندر کسی بھی چیز پر منطقی و معقولی طریقے و ترتیب سے سوچنے اور صحیح فیصلے کرنے کی قابلیت دوسروں کے مقابلے زیادہ ہوتی ہے اس ذہانت کے حامل اچھے، نظریہ ساز، تجزیہ نگار، کمپیوٹر پروگرامر، ریسرچر، ماہر معاشیات اور محاسب بن سکتے ہیں۔

### لسانی ذہانت linguistic intelligence

اس ذہانت والوں میں گرامر، الفاظ اور زبان وغیرہ سیکھنے کی رفتار اور قوت گفتار دوسروں کے مقابلے زیادہ ہوتی ہے، یہ لوگ بہترین ایڈیٹر، ٹیچر، جرنلسٹ، وکیل اور خطیب بن سکتے ہیں۔

### خلائی و ابعادی ذہانت Spatial intelligence

ان کے اندر بعد و مسافت اور سمت کا صحیح اندازہ لگانے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے، تخیلاتی قوت غیر معمولی ہوتی ہے اور منظر کشی بہترین طریقے سے کر سکتے ہیں، ایسے لوگ زیادہ اچھے گرافک ڈیزائنر، پائلٹ، آرکیٹیکٹ، کندہ کار اور آرٹسٹ بن سکتے ہیں۔

### موسیقی و نغماتی ذہانت musical intelligence

انہیں نغموں اور سروں کو سیکھنے پہنچانے اور آلات نغمہ کو استعمال کرنے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے ایسے لوگ بہترین نعت خواں ثابت ہو سکتے ہیں۔

### جسمانی و عضلاتی ذہانت Kinesthetic intelligence

ان کے بازوؤں میں طاقت اور جسمانی حرکت والے کام کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے، حس لمس تیز ہوتی ہے، اور ان کے ذہن و جسم میں بہترین مطابقت ہوتی ہے، ایسے لوگ

پڑھنے سے زیادہ باہر جا کر اپنے اعضاء کو استعمال کرتے ہوئے سیکھنے کو ترجیح دیتے ہیں، ایسے لوگ بہترین، اسپورٹس مین، فزیکل تھیراپسٹ، فزیکل ٹرینر، لوہار، مستری ٹیکنیشن اور ویلڈر بن سکتے ہیں۔

### تعمالی ذہانت Interpersonal intelligence

ان میں مخاطب کی نیت، تخریض اور تمنا کو سمجھنے اور استعمال کرنے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے، تحریری اور زبانی رابطے میں جلد مہارت حاصل کر لیتے ہیں، ایسے لوگ زیادہ بہتر مینیجر، ایڈمنسٹریٹر اور کاؤنسلر بن سکتے ہیں۔

### خود شعوری ذہانت Intrapersonal intelligence

ان میں خود کو بہتر طریقے سے جاننے، اپنے مزاج، امید، تمنا اور احساسات کو بہتر طریقے سے سمجھنے کی صلاحیت ہوتی ہے، ایسے لوگ بہترین سائیکالوجسٹ یعنی ماہر نفسیات، تھیراپسٹ اور ماہر الہیات بن سکتے ہیں۔

### جذبائی ذہانت Emotional intelligence

یہ ذہانت اوپر کی دونوں ذہانت کا مجموعہ ہے نیز ان میں دوسروں کے جذبات کو سمجھنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت دوسروں کے مقابلے زیادہ ہوتی ہے، ایسے لوگ بہترین رائٹر فلم میکر اور اداکار بن سکتے ہیں۔

### فطرت پسند ذہانت Naturalistic intelligence

انسان اور دیگر مخلوقات میں ربط کا احساس و تفہیم ان میں زیادہ ہوتی ہے، اور فطرت کی کھوج کارحجان ان میں زیادہ پایا جاتا ہے، ایسے لوگ جانور ٹرینر، بائیولوجسٹ، ماہر نباتات اور بہترین فوٹو گرافر بن سکتے ہیں۔

## آئیڈیاتی و تخلیقی ذہانت Creative intelligence

ان میں غیر معمولی زاویے سے سوچنے کی صلاحیت ہوتی ہے، تخلیقی دنیا کے باسی ہوتے ہیں، نئے نئے آئیڈیاز ڈھونڈنا مشکلات کے سولوشن بنانا اور ہر وقت کسی نئے خیال کے جستجو میں رہنا ان کی خاصیت ہوتی ہے۔

## وجودی و روحانی ذہانت Existential and Spiritual intelligence

بنیادی قسم کے سوالات ان کی زندگی کے خیالات کا محور ہوتے ہیں مثلاً زندگی کا مقصد کیا ہے موت کی کیا معنی ہیں، مر کر ہم کہاں جائیں گے وغیرہ وغیرہ، یہ روحانی و فلسفیانہ مزاج ان کا زیادہ ہوتا ہے، یہ زیادہ مراقبہ کرنے اور اکیلے بیٹھ کر سوچتے رہنے کو ترجیح دیتے ہیں، ایسے لوگ بہترین صوفی، فلسفی، مبلغ، مراقبہ ٹرینر اور پبلک اسپیکر بن سکتے ہیں۔

## اجتماعی ذہانت Collaborative intelligence

ٹیم کو لے کر کام کرنے اور تعلقات بنانے کی صلاحیت ان میں زیادہ ہوتی ہے، ایسے لوگ زیادہ بہتر لیڈر، سوشل ورکر اور پروجیکٹ مینیجر بن سکتے ہیں۔

## ذہانت اور مواقع

ہر ذہانت سے متعلق مزید کیئر اور میدان کار کی معلومات کے لیے نیٹ پر careers to...related intelligence خالی جگہ پر مطلوبہ ذہانت کا نام لکھ

دیں۔

بندے کے نزدیک ایک کامیاب ادارے کی تعریف کا سب سے اہم جزو یہ ہے کہ وہ ادارے اپنے نصاب تعلیم و تربیت کے ذریعے ایک بچے کو ذہانت کی ان تمام اقسام کو استعمال کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہو، اور ان کی نشوونما پر اپنے بچے کا اکثر حصہ خرچ کرتا ہو۔

ذہانت کیسے بروئے کار لائی جائے؟

تو ہمیں کرنا یہ ہے کہ ان تمام اقسام کی مشق کے مواقع ڈھونڈنے ہیں، اگر نہیں ہیں تو مواقع بنانے ہیں، مثلاً مدارس میں منطقی ذہانت کی مشق کے لیے ڈبیٹ اور بحث میں شرکت کرنا، لسانی ذہانت کے لیے نئی نئی زبانیں سیکھنا، خلائی و ابعادی ذہانت کے لیے لکڑی کے قلم سے کیلیگرافی سیکھنا، عضلاتی ذہانت کے لیے جیم کرنا کراٹے سیکھنا، نغماتی ذہانت کے لیے حسن قرأت اور نعت کی مشق کرنا نعتیہ و قرأت کے مسابقوں میں شرکت، تعالیٰ ذہانت کے لیے تبلیغی جماعت میں وقت لگانا اور ضلعی و ریاستی انجمنوں کے تقریری و تحریری مسابقوں میں شرکت، خود شعوری ذہانت کے لیے نفسیات کو پڑھنا اور خود پر اپنے دوستوں پر اس کے تجربات کرنا، جذباتی ذہانت کے لیے مصیبت زدہ لوگوں کی اذیت کو محسوس کرنا ان کے درمیان وقت گزارنا، شاعری پڑھنا، وقتاً فوقتاً رونے کی عادت ڈالنا کیوں کہ آنسو ہمارے احساس میں شدت اور خلوص پیدا کرتے ہیں، فطرت پسند ذہانت کے لیے خالی اوقات کو فطری مناظر کے قریب گزارنا، پالتو جانوروں کو کھلانا ان کے ساتھ کھیلنا، وجودی ذہانت کے لیے مراقبہ، تصوف کے منازل سلوک طے کرنا، کچھ وقت اکیلے گھر کی کسی خاموش جگہ پر یا جنگلوں میں ٹہلتے ہوئے زندگی کی معنویت پر غور کرنا، تخلیقی ذہانت کے لیے ہر اس چیز پر جسے آپ دیکھ رہے ہوں سن رہے ہوں یا پڑھ رہے ہوں، غور کرنا کہ اس میں مزید کیا کیا جاسکتا ہے، کیا احتمالات ہو سکتے ہیں، مزید کن زاویوں سے اس پر سوچا جاسکتا ہے، مسائل کے حل تلاش کرنا اور اجتماعی ذہانت کے لیے سوشل ورک کرنا، انجمنوں کے انتظامی امور سے مربوط رہنا، ویلفیئر کے کاموں میں سیاست میں حصہ لینا وغیرہ وغیرہ۔

اور مجموعی طور پر اپنی ذہانت میں اضافہ کرنے کا سب سے بہترین طریقہ ہے لکھنا، کیوں کہ یہ سوچنے کی صلاحیت میں اضافہ کرتا ہے، ہماری سوچ کو مرتب و منظم کرتا ہے، یہ ایک سان چڑھانے والا پتھر ہے جس پر ہم اپنے دماغ کی چھڑی کو دھاردار بن سکتے ہیں، تلوار کے بعد قلم سب سے بڑا ہتھیار ہے جس سے خیالی اور حقیقی دنیا دونوں کو فتح کیا جاسکتا ہے،

مرتبہ: مریم اقبال

## خدا کا وجود

### غور و فکر کی دعوت

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعْمَهُ ظٰهِرًا  
وَبَاطِنًا وَمِنَ النَّاسِ مَن يُجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتٰبٍ مُّنِيْدٍ - (سورۃ لقمان: ۲۰-۳۱)

(لوگو!) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے تمہارے لئے ان تمام چیزوں کو مسخر فرمادیا ہے جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، اور اس نے اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں تم پر پوری کر دی ہیں۔ اور لوگوں میں کچھ ایسے (بھی) ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں بغیر علم کے اور بغیر ہدایت کے اور بغیر روشن کتاب (کی دلیل) کے۔

اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا جس کا مفہوم یہ ہے کہ لوگو! کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ رب العزت نے تمہاری لیے چیزوں کو مسخر بنا دیا ہے، یعنی کیا تم نے یہ نہیں دیکھا کہ اللہ رب العزت نے کائنات کی جملہ موجودات کو ایک خود کار نظام کے ذریعے تمہارے اوپر مسخر کر دیا ہے، اور ایسی نعمتیں بھی ہیں جن سے تم فیضیاب ہوتے ہو لیکن تم انہیں دیکھ نہیں سکتے۔ اور فرمایا کہ لوگوں میں کچھ ایسے بھی جو اللہ کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں، اور جھگڑا بھی بغیر علم و تحقیق، ہدایت اور بغیر روشن کتاب کے کرتے ہیں۔ اور نہ ان کے پاس کوئی قطعی دلیل ہے نہ ہی علم و دانش۔ اور ایسے لوگ بھی ہیں جن کو اللہ رب العزت نے کتاب دی، روشن ہدایت دی اور حبیب ﷺ یہ مبارک کتاب ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے تاکہ لوگ اس میں تدبر کریں۔ اور اس کتاب کے اندر مخفی حقیقتوں کو جانیں۔

بلکہ قلم کو بایں طور تلوار پر جزوی فضیلت حاصل ہے کہ تلوار سے خیالی دنیا پر فتح نہیں مل سکتی، اور حقیقی انقلاب کے لیے پہلے خیالی دنیا پھر مادی دنیا دونوں پر فتح لازم ہے، ایک کے بغیر دوسرے کی فتح ہمیشہ عارضی اور قلیل المدتی ہوتی ہے۔

میرے اندر کون سی ذہانت خدا داد ہے؟

اب تمام اقسام کی مشق کرنے کے بعد ہوگا یہ کہ کچھ اقسام کی جانب فطری میلان محسوس ہوگا یعنی اس طرف میرا ذہن زیادہ چل رہا ہے، یہ ہماری خدا داد ذہانت ہوگی، خدا داد کا مطلب بس اتنا ہے کہ محنت کرنے پر ذہانت کی اس قسم سے متعلق میدانوں پر ہماری گرفت اوروں کے مقابلے جلدی ہو جائے گی، اس قسم کو متعین کریں، اس سے متعلقہ فیلڈز پر فوکس کریں لیکن مشق مسلسل تمام اقسام کی جاری رکھنی ہے کیوں کہ یہ تمام اقسام آپس میں ایک دوسرے سے گھلے ملے ہوئے ہیں، ذہانت کی ایک قسم پر مشق دوسری قسم کو بھی مضبوط کر رہی ہوتی ہے۔

اللہ رب العزت نے دراصل اس آیت کے ذریعے پیغام یہ دیا ہے کہ جنہوں نے جاننا ہو کہ اللہ کہاں ہے وہ کیا ہے، تو وہ دائیں بائیں کسی جانب نہ دیکھے اور نہ ہی کسی گمان پر بھروسہ کرے بلکہ اللہ کی کتاب کی طرف آجائے اسے اس کا پتہ مل جائے گا۔ اور دین کو کیوں اپنائیں اسے اس سوال کا جواب بھی قرآن مجید سے مل جائے گا۔

بعض ذہنوں میں یہ خیال آتا ہے کہ اگر خدا ہے تو کہاں ہے اس کا پتہ کیا ہے؟

اللہ پر جتنا یقین کامل ہوتا جائے گا اتنا ہی انسان اللہ سے جڑتا چلا جائے گا اور اتنا ہی بندہ اللہ کے قریب ہوتا چلا جائے گا اور بندے پر اس کی بندگی کا رنگ چڑتا چلا جائے گا۔

پتہ اس شخص کا ہوتا ہے جو صرف ایک جگہ موجود ہو، اس کا پتہ نہیں ہوتا جو ہر جگہ پر موجود ہوتا ہے۔ جس کے احاطے میں زمین و آسمان کی ساری کائنات ہو اس کا پتہ کہیں نہیں ہوتا۔

جو حقیقت ہر جگہ ہوتی ہے اس کا پتہ نہیں ہوتا۔ جیسے خون جسم میں ہر جگہ گردش کرتا ہے تو اس کا کوئی ایک پتہ نہیں ہوتا۔ جیسا کہ آپ کے جسم میں سیل (خلیہ) ہیں تو ان کو بھی کوئی پتہ نہیں ہوتا۔

اللہ رب العزت نے قرآن پاک میں فرمایا:

وَاللَّهُ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُولُوا فَجْهَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ - (سورۃ البقرہ آیت ۲: ۱۱۵)

اور مشرق و مغرب (سب) اللہ ہی کا ہے، پس تم جدھر بھی رخ کرو ادھر ہی اللہ کی توجہ ہے (یعنی ہر سمت ہی اللہ کی ذات جلوہ گر ہے)، بیشک اللہ بڑی وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے۔

اور مشرق و مغرب کی ساری سمتیں اللہ کیلئے ہیں سو تم جدھر بھی رخ کرو گے ادھر ہی اللہ کو ہی پاؤ گے۔ گویا کہ ساری کائناتیں اللہ رب العزت کے احاطے میں ہیں۔

پورے سولر سسٹم میں اربوں پلانٹ ہیں جو کہ گھوم رہے ہیں اور سورج بھی گھوم رہا ہے۔ وہ ایک کہکشاں ہے (ملکی وے گلیکسی) جس میں لاکھوں ستارے اور سیارے گھوم رہے ہیں اور یہ کہکشاں بھی گھوم رہی ہے۔ اس جیسی اور بھی کھربوں کائناتیں ہیں اور اللہ رب العزت ان ساری سماوی کائناتوں سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور اللہ عرب العزت نے ان کائناتوں کو ایک خود کار نظام کے ذریعے مسخر بنایا ہوا ہے۔

اللہ کائنات کی ہر شے پر محیط ہے۔ چونکہ وہ ہر شے پر محیط ہے اس لیے وہ نظر نہیں آتا۔ کیونکہ نظر کی ایک حد ہے۔

اللہ رب العزت نے اپنا جو پہلا پتہ قرآن مجید میں خود دیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ لوگ ایمان والے ہیں جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔

قرآن مجید کہتا ہے کہ ان حقیقتوں پر ایمان لے آؤ جو دیکھائی نہیں دیتیں۔ یہ جملہ بہت سائنٹیفک ہے یعنی ایمان بالغیب جب تک نہیں ہو گا ایمان کا پودا آپ کے دل میں اگ ہی نہیں سکتا۔

اللہ رب العزت نے یہ کیوں فرمایا کہ غیب پر ایمان لاء، غیب اس شے کو کہتے جو موجود تو ہو لیکن مشہود نہ ہو۔ یعنی موجود تو ہو لیکن نظر نہ آئے۔ نظر کیوں نہیں آسکتیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے دیکھنے اور نگاہ کی ایک حد limitation ہے جس کی وجہ سے مذکورہ شے کو آنکھ دیکھ نہیں سکتی۔ کائنات میں لاکھوں چیزیں ایسی ہیں جو نظر نہیں آتیں لیکن ہم انہیں مانتے ہیں۔

کسی چیز کو ماننے کے دو طریقے ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ پانچ حواس (حواس خمسہ) ان کے ذریعے اشیاء کو direct feel کیا جاتا ہے یا براہ راست ان کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ اور دوسرا یہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے اور پھر اس کا نتیجہ اخذ کرنا کہ کوئی نہ کوئی چیز ہے جو اس کی پیچھے ہے جس کی وجہ سے یہ کام ہو رہا ہے۔ جو نتائج اخذ کیے جاتے ہیں وہ

حضرت علی کرم اللہ فرماتے ہیں کہ علم میں وہی لوگ پختہ ہیں جو غیب کے پردوں میں چھپی ہوئی چیزوں پر اعتقاد رکھ لیتے ہیں۔ اسی لیے اللہ رب العزت نے ان کی مدح کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ یہ چیز ہمارے احاطہ علم میں نہیں ہے، اور وہ لوگ جو اپنے محدود ہونے کا اعتراف کر لیتے ہیں وہی راسخون فی العلم ہیں۔ چونکہ ہمارے ذرائع محدود ہیں اس لیے ہمارے دماغ کا سمجھنا بھی محدود ہے۔

بہت سی چیزیں ہیں جو نظر نہیں آتیں لیکن ہم اس کو مانتے ہیں۔ سائنس میں سب atom کو جانتے ہیں لیکن کسی نے بھی ایٹم کو دیکھا نہیں ہے۔ صرف یہ نہیں کہ ننگی آنکھ سے نہیں دیکھا، بلکہ دنیا کی کسی بھی پاور فل خوردبین سے بھی آج تک ایٹم نہیں دیکھا جا سکا۔ لیکن سب اس کو مانتے ہیں تو مان لیں کہ یہی علم غیب ہے۔ ایٹم اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ روشنی جس کی مدد سے انسان دیکھتا ہے ایٹم اس کی wavelength سے بھی چھوٹا ہوتا ہے اس وجہ سے نظر نہیں آتا۔

انسانی جسم اربوں کھربوں سیلز (خلیوں) سے مل کر بنا ہوا ہے۔ ہر سیل کے اندر نیوکلیس nucleus ہوتا ہے اور پورے سیل کا مدار اس پر ہوتا ہے سائنس کی ہر کتاب میں اس کی تصویر دکھائی جاتی ہے لیکن آج تک کسی سائنس دان نے اس نیوکلیس کو بھی نہیں دیکھا، جس روشنی سے انسان دیکھتا ہے اس کی wavelength 500nm - 200nm تک ہوتی ہے انسان دیکھ سکتا ہے، اس سے کم ویولینتھ ہو تو انسان دیکھ نہیں سکتا اور ایٹم کی ویولینتھ 1/10 nm ہوتی ہے۔ آج سائنس یہ کہتی ہے کہ ایٹم کو دیکھا نہیں جا سکتا۔ گویا ایٹم کو نہیں دیکھا، سیل کو نہیں دیکھا پھر بھی لوگ مانتے ہیں۔ پہلے یہ سوچا جاتا تھا کہ کائنات کا سب سے چھوٹا وجود ایٹم ہے پھر پتہ چلا ایٹم بھی ٹوٹتا ہے اور تین حصوں میں تقسیم ہوتا ہے پروٹون، نیوٹرون اور الیکٹرون میں۔ سائنس کی ہزاروں لاکھوں کتابیں اس سے بھری پڑی ہیں۔ نیوٹرون، الیکٹرون اور پروٹون بھی آج تک کسی سائنس دان نے نہیں دیکھے۔ انسان نے نہ ہی

دکھائی نہیں دیتے۔ جو نظر آتے ہیں وہ ہیں اعمال اور ان اعمال کا نتیجہ غیب ہوتا ہے، مثال کے طور پر آپ پھول کو دیکھ سکتے ہیں لیکن اس کی خوشبو کو نہیں دیکھ سکتے۔ پھول کی قدر و منزلت خوشبو کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس کی قدر و منزلت اس کو دیکھنے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی خوشبو کی وجہ سے ہے جو نظر نہیں آتی۔ اسی طرح پھل کو دیکھ کر اس کی قدر و منزلت کا اندازہ نہیں ہوتا بلکہ اس کا ذائقہ ہے جو اس قدر و منزلت دیتا ہے۔ زبان میں نرورز (Nerves) ہوتی ہیں کئی ہزار نرورز جو دماغ تک پیغام پہنچاتی ہیں۔ اور دماغ اس کی قدر و منزلت کا فیصلہ کرتا ہے۔ اور اسے معنی دیتا ہے۔ اسی طرح کان آواز سنتے ہیں لیکن وہ ان آوازوں کا فیصلہ نہیں کرتے ان کا فیصلہ بھی دماغ ہی کرتا ہے۔

دماغ اس پوری کائنات میں سب سے بڑا قابل ترین عضو ہے۔ باوجود اس کے اگر آنکھ اس کو میسج نہ بھیجے تو دماغ اسے کچھ بتا نہیں سکتا۔ اصل میں آنکھ نہیں دیکھتی دماغ بتاتا ہے اسی طرح باقی اعضاء کو بھی دماغ ہی بتاتا ہے کہ ان کے ہر عمل کا رد عمل کیا ہوگا۔ دماغ فیصلہ کرتا ہے کہ آنکھ نے کیا دیکھا ہے۔ دماغ ہی ہے جو اس کی تمیز کرتا ہے۔ آنکھ خود فیصلہ نہیں کر سکتی کہ یہ کیا ہے بلکہ دماغ ہے جو فیصلہ کر کے بتاتا ہے۔ اگر آنکھ، کان، ناک میسج نہ بھیجیں تو دماغ کچھ نہیں بتا سکتا۔ لہذا اس سے یہ سمجھ آتا ہے کہ دماغ سارے کاسار اپنی غامضات کا محتاج ہے۔ دماغ کو میسج ملتا ہے تو وہ اسے سمجھ کے واپس میسج بھیجتا ہے۔

اگر خواہ دماغ کو میسج نہ کریں تو دماغ اس چیز کو کبھی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ اگر خواہ خمسہ کا کام ہی رک جاتے تو دماغ کو کچھ سمجھ نہیں آئے گا۔ ہر چیز کا اپنا اپنا دائرہ ہے لیکن سب کی ڈائریکٹ کمیونیکیشن دماغ کے ساتھ ہے جو اس کو سمجھتا ہے۔

لہذا سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ہماری بطور انسان محدودیت ہے اور ہمارا محدود ہونا اللہ کی موجودگی کی نفی (negate) نہیں کر سکتا۔

ایٹم دیکھا ہے، نہ ہی سیل دیکھا ہے اور نہ انسان نے پروٹون، نیوٹرون اور الیکٹرون دیکھے ہیں۔ جب انسان اس کو مانتا ہے جو سائنس نے بھی نہیں دیکھا تو وہ کیوں اس کو نہیں مانتا جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے بتایا ہے۔

پروٹون ایٹم سے ایک لاکھ گنا چھوٹا ہوتا ہے، اس لیے سائنس کے مطابق کبھی بھی ممکن نہیں ہوگا کہ اس کو دیکھا جاسکے۔ یعنی کسی نے اس کو دیکھا نہیں ہے لیکن پھر بھی ہر سائنسدان اس پر یقین رکھتا ہے۔

سائنس سے یہ سوال ہے کہ جب یہ سب کچھ دیکھا نہیں تو مانتے کیوں ہیں تو سائنس کہتی ہے I can,t see it, but I can see its effects.

یعنی کہ میں اسے دیکھ نہیں سکتا لیکن اس کے اثرات نظر آتے ہیں کہ کچھ نہ کچھ ہے جو اس کے پیچھے ہے۔ اسی طرح جب ہم کائنات کے نظام کو دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی چلانے والا ہے اور وہ ہے اللہ۔

ہمیشہ یاد رکھیں کہ کسی نتیجے پر پہنچنے کیلئے بنیاد علم پر رکھیں۔

جب آپ دو چیزوں کے درمیان موازنہ کرتے ہیں کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے تو یہ ضروری ہے کہ دونوں طرف کا علم آپ کے پاس ہو۔

اس لیے اللہ رب العزت نے فرمایا کتنے لوگ ایسے ہیں جو اللہ کی موجودگی کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں ان کے پاس نہ تو ہدایت ہے اور نہ ہی اللہ کی طرف سے کوئی کتاب۔

قرآن مجید میں 856 آیات ایسی ہیں جس میں اللہ رب العزت نے علم کی دعوت دی ہے اور قرآن مجید کی کل آیات 6 ہزار 6 سو سے زائد ہیں۔

اور 900 سے زائد ایک ہزار کے قریب آیات مبارکہ ایسی ہیں جن میں اللہ رب العزت نے مختلف سائنسی حقائق بیان کیے ہیں۔ یعنی پورے 2 ہزار آیات مبارکہ ایسی ہیں جن

میں علم اور تدبر کا ذکر کیا گیا ہے۔

قرآن مجید نے انسانیت کی ابتدا کا ذکر کیا اور انسان کی جو فضیلت بیان کی وہ بھی علم پر مبنی ہے۔

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا (سورۃ البقرہ، آیت ۳۱:۲)

آخری نبی ﷺ اور ان پر جو آخری کتاب نازل ہوئی اس کی ابتداء بھی اقرار سے ہوئی کہ پڑھ یعنی اس کی ابتداء بھی سائنس اور علم سے ہوئی۔

اللہ رب العزت نے قرآن حکیم میں جا بجا فرمایا کہ اس طرح ہم اپنی نشانیاں بیان کرتے ہیں تاکہ علم والوں کو سمجھ آجائے۔ اور فرمایا ہم اپنی نشانیاں بیان کرتے ہیں ان لوگوں کیلئے جو تفکر رکھتے ہیں۔

جو کتاب جگہ جگہ آپ کو علم، تفکر اور تدبر کی دعوت دے اور ساتھ پیغام دیتی ہے کہ ان سے پوچھو جو علم والے ہیں۔ تو یاد رہے کہ جو کتاب 2 ہزار مرتبہ علم، تفکر اور تدبر کی دعوت دے وہ کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔

قرآن مجید تدبر کی دعوت دیتا ہے فرمایا: یہ لوگ تدبر کیوں نہیں کرتے، اگر یہ کتاب اللہ کے سوا کسی کی طرف سے نازل ہوتی تو یہ لوگ اس میں غلطیاں دیکھتے۔

فرمایا: یہ لوگ قرآن میں تدبر کیوں نہ کرتے کیا ان کے دل و دماغ پر تالے لگے ہوئے ہیں۔

قرآن پاک کے سائنسی احکامات کو سن کر کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب سائنس کچھ ایجاد کر لیتی ہے تو دینی طبقہ پھر اس کو قرآن پاک میں سے تلاش کر لیتا ہے، تو سوال یہ ہے کہ جب

سائنسی تحقیق ہو جاتی ہے تو کیوں صرف مسلمان ہی اس کو ڈھونڈ نکالتے ہیں باقی مذاہب اپنی کتب سے اس کو کیوں نہیں ڈھونڈ پاتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کتب میں یہ سائنسی حقائق

بیان ہی نہیں ہوئے ہوتے۔

قرآن مجید نے اس چیز کا بھی اشارہ دے دیا کہ کس طرح وقت کے ساتھ ساتھ حقائق کھلیں گے۔ فرمایا: "ہر خبر جو ہم قرآن میں دے رہے اس کے ظاہر ہونے کا ایک وقت مقرر ہے۔" یعنی خبر دے دی ہے اور بتا دیا کہ جب وقت آئے گا تم اس کو جان جاؤ گے۔

### اہم نکات

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا کہ قرآن مجید کی آیات پر غور و تدبر کریں اور اہل عقل و دانش ان سے ہدایت و رہنمائی حاصل کریں۔

قرآن مجید نے اپنے ماننے والوں کو بار بار دعوت دی کہ غور کرو، تدبر سے کام لو، تحقیق سے کام لو، علم سے تعلق جوڑو، جو کتاب اپنے ماننے والوں کو غور و فکر کی دعوت دے کیا وہ کتاب غلط ہو سکتی ہے؟ اس لیے قرآن کا دعویٰ ہے کہ دنیا بھر کے اہل زبان مل کر اس جیسی کوئی ایک آیت یا سورۃ لے آؤ؟

جو چیزیں حواسِ خمسہ کے ذریعے محسوس ہوں ان کو انسان جان لیتا ہے مگر جو چیزیں حواسِ خمسہ سے ماوراء ہوں انہیں سائنسدان اور سائنس کچھ نشانیوں سے جانتی اور پہچانتی ہے، جیسے پھول کو تو ہم دیکھ سکتے ہیں مگر خوشبو کو نہیں دیکھ سکتے۔ مگر اس کے وجود سے انکار بھی نہیں کر سکتے۔

سائنسی ایجادات اور فتوحات کی عمر گزشتہ دو صدیاں ہیں، اس سے پہلے تو سائنس خود نامک ٹونیاں مار رہی تھی۔ قرآن نے 14 سو سال قبل اعلان کر دیا تھا کہ وقت آئے گا تو تم جان لو گے کہ اللہ نے اس کتاب میں جو بیان کر دیا وہ حق ہے۔ وقت مقررہ پر تم یہ سب جان لو گے اور ساری گتھیاں سلجھتی جائیں گی۔

اب سوال یہ ہے کہ تحقیق ہو جانے کے بعد ہی کیوں نکالتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے قرآن مجید میں بہت سے سائنسی حقائق کا بیان ہے۔ جب انسان کے پاس سائنسی علم آتا ہے تو وہ اس کی تہہ تک پہنچتا ہے۔ اللہ رب العزت نے سورہ نوح میں فرمایا اے لوگو! اللہ رب العزت نے تمہاری تخلیق مرحلہ وار کی ہے، قرآن مجید نے یہ بات 1400 سال پہلے بیان کر دی تھی تو یہ جو الفاظ ہیں کہ مرحلہ وار انسان کی تخلیق کا ہونا اس کا علم انسان کو پچھلی صدی میں ہوا ہے۔ سائنس نے مائیکروسکوپ کے ذریعے بچے کی تخلیق کے مراحل کا پتہ 1941ء میں لگایا قرآن مجید کے وہی بات 1400 سال پہلے بیان کی تھی۔ تو یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ قرآن مجید کی آیات مبارکہ تب ہی مطابقت میں بیان ہوں گی جب سائنس کا علم اور تحقیق بیان کی جائے گی۔ سورہ عبس کی آیت ۱۹ میں فرمایا: "اللہ رب العزت نے انسان کو نطفہ سے بنایا، مرد کا سیل اووم ہوتا اور عورت کا اووم بناتا ہے اور دونوں کے ملنے سے جو بنتا ہے وہ نطفہ ہے جس کے اندر سارے خدو خال رکھ دیے جاتے ہیں۔ اسی نطفے میں اس کی سب ٹریٹس کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جو قرآن مجید نے 1400 سال پہلے بیان کر دی ہے۔ جب سائنس نے تحقیق کے بعد بتایا تو علماء کی نگاہ گئی کہ یہ بات تو 1400 سال پہلے قرآن مجید میں بیان ہو چکی ہے۔

اللہ رب العزت نے فرمایا جب تم ماں کے رحم میں ہوتے ہو تو جو کچھ تم نے بننا ہوتا ہے اس کا فیصلہ کر لیا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں حقائق موجود ہیں اور ان حقائق کو سمجھنے کیلئے انسان سائنسی علم کا محتاج ہے۔

ایمان بالغیب ہی وہ صفت ہے جس سے ایمان کاراستہ نکلنا ہے، غیب عربی زبان کا لفظ ہے، غیب اس چیز کو کہتے ہیں جو موجود تو ہو مگر مشہود نہ ہو یعنی دکھائی نہ دے سکے، جس چیز کو دیکھنا نہ جاسکے اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ موجود نہیں ہے، بہت ساری چیزیں ہیں جو موجود تو ہیں مگر ہماری آنکھ انہیں دیکھ نہیں سکتی۔

جو ہر جگہ موجود ہو اس کا کوئی ایک پتہ نہیں ہوتا، جس کا ایک پتہ ہوتا ہے وہ ہر جگہ موجود نہیں ہوتا، اللہ ان جگہوں پر بھی ہے جس کا ہمیں علم نہیں ہے۔

خدا ہر جگہ موجود ہے اس دعوے کا جواب قرآن نے ان الفاظ میں دیا ہے کہ ساری کائنات اس کے احاطے میں ہے، شرق تا غرب سب کچھ اسی کی دسترس میں ہے، ساری کہکشاں جن کی تعداد اربوں میں ہے یہ نظام شمسی اور یہ سارا سورسٹم ایک چھوٹی سی چیز ہے، اللہ ان سب سے بڑا ہے۔

نوجوان اپنا تعلق علم اور کتاب سے جوڑیں، علم میں پختگی کے لیے خوب محنت کریں اور مطالعہ کا شوق پیدا کریں۔ قرآن مجید پر غور و فکر کریں اور تحقیقی موازنے کی طرف آئیں۔ قرآن میں 856 آیات ایسی ہیں جن میں اللہ نے علم کی ضرورت و اہمیت پر زور دیا ہے، جب کہ ایک ہزار کے قریب آیات میں بالواسطہ یا بلاواسطہ سائنسی حقائق بیان کیے گئے ہیں۔ قرآن مجید میں پونے دو ہزار آیات ایسی ہیں جن میں علم اور سائنس کی بات کی گئی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سائنس ایجادات کرتی ہے اور پھر بعد میں انہیں قرآن کے اندر سے ڈھونڈ نکالا جاتا ہے کہ یہ سائنسی حقیقت قرآن میں موجود ہے۔ سوال کرنے والے کہتے ہیں اگر یہ قرآن میں موجود تھا تو مسلمانوں نے یہ ایجادات خود کیوں نہیں کیں؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ کسی اور مذہب نے اپنی مذہب کتاب سے یہ حقائق کیوں نہ ڈھونڈ نکالے؟ قرآن میں

یہ حقائق موجود ہیں تو نکالے گئے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ان حقائق تک رسائی کے لیے دونوں طرف کا پختہ علم ہونا شرط اول ہے، جوں جوں سائنس کائنات کے پردے اٹھاتی چلی جائے گی وہ قرآن کے دعوؤں اور معارف و معانی کی توثیق کرتی چلی جائے گی کیونکہ یہ سب حقائق 14 سو سال قبل قرآن نے بیان کر دیے ہیں۔

قرآن مجید نے 14 سو سال قبل جو حقائق بیان کیے انہیں آج کے دن تک کوئی جھٹلا نہیں سکا اور قرآن نے جو چیلنج کیے وہ چیلنج بھی آج دن تک کوئی قبول نہیں کر سکا، جو کتاب چیلنج کرے، غور و فکر کی دعوت دے ایسی کتاب جھوٹ ہو سکتی ہے؟

قرآن کہتا ہے کہ اگر زمین و آسمان میں موجود نشانیوں پر غور کرو گے تو ان میں سے ہر نشانی اللہ کی ذات کا پتہ دے گی، اللہ ہر چیز پر محیط ہے اس لیے وہ نظر نہیں آتا، نظر کی ایک حد ہے، نظر کی استعداد حواس خمسہ کی مرہون منت ہے اور ان کے دائرہ کار کی ایک حد ہے جب کہ اللہ لا محدود اور بے حد ہے، حد والے حواس بے حد کو نہیں دیکھ سکتے اسی لئے فرمایا گیا غیب پر ایمان لاؤ۔

جب یقین کمزور ہو جاتا ہے تو پھر بعض ذہنوں میں یہ خیال جنم لیتا ہے کہ اگر خدا ہے تو وہ کہاں ہے اور اس کا پتہ کیا ہے؟

## اخلاقی شخصیت کی تشکیل

خلق اس پختہ انسانی کیفیت کو کہتے ہیں جس میں انسان اپنے ارادے و اختیار سے اچھے یا برے اعمال بجالاتا ہے۔ اگر انسان اپنے رب کو پہچان لے اور معرفت رب اس کی فطرت صحیحہ بن جائے تو اس سے بلا تکلف اچھے اعمال سرزد ہوں گے۔ اور اسی کا نام حسن خلق ہے۔ بصورت دیگر برے اعمال کرے گا اور بد اخلاق کہلائے گا۔

دین کا اصل مقصد اللہ کی رضا کا حصول ہے۔ جیسا کہ سورۃ الفتح آیت 29 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَهْدَاءٌ عَلَى الْكُفَّارِ رَحِمَاءٌ مِّنْهُمْ قُتِلُوا ذُكِّرُوا سَجْدًا  
يُؤْتُونَ فُضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا۔ (سورۃ الفتح آیت ۲۹)

"محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو ان کے ساتھ ہیں، وہ کافروں پر بہت بھاری اور آپس میں بہت رحم دل ہیں تم دیکھو گے انہیں رکوع کرتے ہوئے، سجدہ کرتے ہوئے، وہ (ہر آن) اللہ کے فضل اور اس کی رضا کے متلاشی رہتے ہیں۔

اس مقصد کے حصول کا ذریعہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت ہے۔ یا بالفاظ دیگر ایمان اور عمل صالح ہے۔

جیسا کہ سورۃ الذاریات آیت 56 میں وارد ہوا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ إِلَّا لِيُعْبُدُونِي۔

"اور میں نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو مگر صرف اس لیے کہ وہ میری بندگی کریں۔"

سورۃ طہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَنْ يَأْتِهِ مَوْثِقًا قَدْ عَمِلَ الصَّالِحَاتِ فَأُولَٰئِكَ لَهُمُ الدَّرَجَاتُ الْعُلَىٰ۔

"اور جو کوئی آئے گا اس کے پاس مؤمن کی حیثیت سے (اور اس حالت میں کہ) اس نے نیک اعمال بھی کیے ہوں، تو یہ لوگ ہیں جن کے لیے اعلیٰ درجات ہوں گے۔"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رضائے الہی کا حصول، جنت میں اعلیٰ درجات اور تقرب الی اللہ کیسے حاصل کیا جائے؟

یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ پہلی رکاوٹ تو خود انسان کا اپنا نفس ہے۔ انسانی نفس کسی قانون یا ضابطہ کی پابندی نہیں کرنا چاہتا۔ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ میری خواہشات بھرپور طریقے سے پوری کی جائیں خواہ جائز طریقے سے پوری ہوں یا ناجائز طریقے سے۔ پھر اس پر مستتراد شیطان اور اس کے حواریوں کا خواہشات اور شہوات کو ابھارنا۔ انہیں پورا کرنے کی ترغیب دینا جبکہ دور حاضر میں تو شر کی قوتیں منظم ہو کر ہر سمت سے انسان پر اس طرح حملہ آور ہو رہی ہیں کہ انسان کا چچنا بہت مشکل ہو گیا ہے اور صراط مستقیم پر چلنے کے لیے بہت زیادہ تنگ و دو درکار ہے۔ اندریں حالات ہمیں اپنے آپ کو، اپنے اہل و عیال کو اور پوری امت مسلمہ کو شیطان اور اس کے حواریوں سے بچانے کی فکر کرنی ہے۔

شیطان اور شیطانی ترغیبات سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی خواہشات کو قابو میں رکھے اور اپنی روح کی غذا کا بھی سامان کرے تاکہ اس کی روح اتنی طاقتور ہو جائے کہ وہ انسانی نفس کو اس کی ناجائز خواہشات کی تکمیل سے روک سکے۔ اسی طرح ایک حسین اخلاقی شخصیت کی تشکیل ہو سکتی ہے۔ احادیث میں اعلیٰ اخلاق کی بہت ترغیب آئی ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(ان البومن لینذرك بحسن خلقه درجته قائم الليل وصائم النهار)۔ (رواہ ابو

داؤد)

"بے شک مومن اپنے اچھے اخلاق سے ان لوگوں کا درجہ حاصل کر لیتا ہے جو رات

بھر نفل نمازیں پڑھتے ہیں اور دن کو ہمیشہ روزہ رکھتے ہوں۔"

مطلب یہ کہ اللہ کے جس بندہ کا حال یہ ہو کہ وہ عقیدہ اور عمل کے لحاظ سے سچا مومن ہو اور ساتھ ہی اس کو حسن اخلاق کی دولت بھی نصیب ہو تو اگرچہ وہ رات کو زیادہ نفلیں نہ پڑھتا ہو اور کثرت سے نفلی روزے نہ رکھتا ہو، لیکن پھر بھی اپنے حسن اخلاق سے ان شب بیداروں عبادت گزاروں کا درجہ پالے گا جو قائم اللیل اور صائم النہار ہوں یعنی جو راتیں نوافل میں گزارتے ہوں اور دن کو عموماً روزہ رکھتے ہوں۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں:

(ان من احبکم الی واقربکم منی مجلسا یوم القیامۃ احسنکھ اخلاقاً)۔

"تم میں سے مجھے زیادہ محبوب وہ ہیں اور قیامت کے دن ان کی نشست بھی میرے زیادہ قریب ہوگی جن کے اخلاق تم میں زیادہ بہتر ہیں۔"

گویا رسول اللہ ﷺ کی محبوبیت اور قیامت کے دن آپ کا قرب نصیب ہونے میں حسن اخلاق کی دولت کو خاص دخل حاصل ہے۔

ابودرداء رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

(ما من شیء اثقل فی میزان المؤمن یوم القیامۃ من حسن الخلق) (ابوداؤد

وترمدی)

"قیامت کے دن مومن کی میزان عمل میں اچھے اخلاق سے زیادہ وزنی چیز کوئی نہ ہوگی۔"

عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ: (اکمل المؤمنین ایمانا احسنهم خلقاً)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"ایمان والوں میں زیادہ کامل ایمان والے وہ لوگ ہیں جو اخلاق میں زیادہ اچھے ہیں۔"

مطلب یہ ہے کہ ایمان اور اخلاق میں ایسی نسبت ہے کہ جس کا ایمان کامل ہوگا، اس کے اخلاق لازماً اچھے ہوں گے۔ اسی طرح جس کے اخلاق بہت اچھے ہوں گے۔ اس کا ایمان

بھی کامل ہوگا۔ البتہ واضح رہے کہ ایمان کے بغیر اخلاق ہی نہیں بلکہ کسی عمل کا بھی کوئی اعتبار نہیں ہے۔ ہر عمل اور ہر نیکی کے لیے ایمان بمنزلہ روح کے ہے۔ اس لیے اگر کسی شخصیت میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان کے بغیر اخلاق نظر آئے تو وہ حقیقی اخلاق نہیں ہے۔ کہیں نہ کہیں کوئی خرابی ضرور ہے۔ اس لیے اللہ کے ہاں اس کی کوئی قیمت نہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے ایمان کے بعد جن چیزوں پر بہت زیادہ زور دیا ہے اور انسان کی سعادت کو ان پر موقوف بنایا ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آدمی بُرے اخلاق سے اپنی حفاظت کرے اور اخلاق حسنہ اختیار کرے۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے جن مقاصد کا قرآن مجید میں ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے لوگوں کا تزکیہ کرنا ہے۔ (ویذکبھم) اس تزکیہ میں اخلاق کی اصلاح اور درستگی کی خاص اہمیت ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان گرامی ہے: (بعثت الائم حسن الاخلاق) "میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقی خوبیوں کو کمال تک پہنچا دوں۔" (رواہ احمد عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ)

یہ اصلاح اخلاق کا کام حضور کی بعثت کے اہم مقاصد میں سے ہے۔ ہونا بھی یہی چاہیے تھا کیونکہ انسان کی زندگی اور اس کے نتائج میں اخلاق کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر انسان کے اخلاق اچھے ہوں تو اس کی اپنی زندگی بھی قلبی سکون اور خوشگواہی کے ساتھ گزرے گی اور دوسروں کے لیے بھی اس کا وجود رحمت اور چین کا باعث سامان ہوگا۔ اس کے برعکس اگر آدمی کے اخلاق بُرے ہوں تو وہ خود بھی زندگی کے لطف و مسرت سے محروم رہے گا اور جن سے اس کا واسطہ اور تعلق ہوگا، ان کی زندگیاں بھی بے مزہ اور تلخ ہوں گی۔ یہ تو خوش اخلاقی اور بد اخلاقی کے وہ نقد دنیوی نتائج ہیں جن کا ہم سب روزمرہ مشاہدہ اور تجربہ کرتے رہتے ہیں، لیکن مرنے کے بعد والی زندگی میں ان دونوں کے نتیجے ان سے بدرجہا زیادہ اہم نکلنے والے ہیں آخرت میں خوش اخلاقی کا نتیجہ رحم الراحمین کی رضا اور جنت ہے جب کہ بد اخلاقی کا انجام خداوند قہار کا غضب اور دوزخ کی آگ ہے۔

اللهم احفظنا منها۔ اللهم انا نسالک الجنة ونعيبها ونعوذبک من النار  
وجحيمها۔

خود کو اعلیٰ اخلاق سے آراستہ کرنے کے لیے ہمیں قرآن اور سنت کی روشنی میں اپنا  
جائزہ لینا ہو گا کہ ہمارے اندر کون کون سی بری عادتیں ہیں۔ برے اخلاق ہیں۔ ان سے کنارہ  
کشی اختیار کرنی ہوگی۔ اسی طرح یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ مجھے کون کون سی اچھی عادتیں اپنانے کی  
ضرورت ہے؟ تبھی ہم اللہ کی نظر میں ایک اچھے اور مطلوب مومن بن سکیں گے۔

جب ہم دینداری سے خود اپنا محاسبہ شروع کر دیں گے تو معلوم ہو گا کہ میرے اندر تو  
یہ ساری برائیاں موجود ہیں۔ ایک طرف تو یہ احساس بہت مفید ہے مگر بعض اوقات دوسری  
طرف یہی چیزیں انسان کو مایوسی کی طرف لے جاتی ہے۔ اور جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیتی ہیں  
کہ میں اتنی ساری برائیوں سے کیسے نجات پاسکتا ہوں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم مایوس نہ  
ہوں۔ اس کے لیے پہلا کام تو یہ کریں کہ اپنی اصلاح کا عزم مصمم کریں۔ یہ عزم کرنا بذات خود  
ایک نیکی ہے۔ دوسرا ضروری کام یہ ہے کہ آج اور ابھی اسی وقت سے اس ارادہ پر کام بھی  
شروع کر دیں۔ آج کا کام کل پر نہ ٹالیں۔ ان برائیوں کو دور کرتے ہوتے اور اندر سے نکلنے میں  
وقت لگے گا۔ بس ہمارا کام یہ ہے کہ ہم برائیوں کے خلاف مسلسل جدوجہد جاری رکھیں۔  
شعوری طور پر یہ بھی جان لیں کہ نہ تو ہم فرشتہ بن سکتے ہیں اور نہ ہی ہم سے فرشتہ بننے کا  
مطالبہ کیا گیا ہے۔ ہم سے صرف یہ مطالبہ ہے کہ ہم اپنا تزکیہ کا عمل مسلسل جاری رکھیں۔  
برائیوں پر نظر رکھیں۔ انہیں پہچانیں اور انہیں دور کرنے کی مسلسل کوشش کرتے رہیں۔  
جس طرح اپنی برائیوں کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح اپنے اندر اچھے اخلاق کو بھی  
پروان چڑھانے کے لیے جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔ تزکیہ کا عمل شروع کرنے کے لیے  
توانائی درکار ہے۔ یہ توانائی ایمان میں اضافہ سے حاصل ہوتی ہے اور اللہ کی آیات پڑھ کر ایمان  
میں گرمی اور حلاوت پیدا ہوتی ہے۔

ترجمہ کے ساتھ سمجھ کر قرآن مجید کی تلاوت کرنے سے ہمارے اندر ایسی پوشیدہ توانائی  
پیدا ہوتی ہے جو ہمیں ہمارے دین پر چلنے، برائیوں کو چھوڑنے اور اچھے اخلاق اپنانے کے  
جذبہ کو پروان چڑھاتی ہے۔ اللہ کی آیات پڑھنے سے دل نرم ہوتا ہے اور دل کے اندر گداز پیدا  
ہوتا ہے اور انسانی نفس نیک کام کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

انسانیت کا اس بات پر اجماع ہے کہ اصلاح معاشرہ کے لیے وعظ و تذکیر، معاشرتی دباؤ  
اور اصلاحی تحریکات ایک حد تک تو مفید ثابت ہو سکتی ہے لیکن ان کے ذریعہ جرائم سے مکمل  
تظہیر عملانا ممکن ہے۔

جرائم سے مکمل ظہیر صرف اسی معاشرے میں ممکن ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ  
نظام عدل و قسط نافذ ہو۔ ہر شخص کے حقوق کا تحفظ ہو اور ہا ہو۔ حکومت کفالت عامہ کی ذمہ دار  
ہو ہر انسان کی بنیادی ضروریات پوری ہو رہی ہوں۔

حدود اور تعزیرات کا نظام قائم ہو۔ لہذا ایک صالح معاشرہ وجود میں لانے کے لیے  
ہمیں غلبہ دین کی جدوجہد کرنی چاہیے۔

اعلیٰ اخلاقی اقدار اور پاکیزہ خصلتیں اس معاشرہ میں پروان چڑھتی ہیں جہاں انہیں قدر  
کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو اور ایسے لوگوں کو عزت و احترام عطا کیا جاتا ہو، لیکن جب سے ہم ہر  
پابندی سے آزاد سوشل میڈیا کے دور میں داخل ہوئے ہیں، ہماری اقدار و معیارات بدل گئے  
ہیں۔ دوسری طرف کاروباری، تشہیری اور پروپیگنڈا کی صنعت نے تمام ترجیحات بدل کر رکھ  
دی ہیں۔ ہر چیز کو لذت نظر، لذت سماع، ذہنی آوارگی اور شہوت رانی کے معیار پر پرکھا جاتا  
ہے۔ ایسے ماحول میں چند پاکیزہ فطرت انسانوں کا وجود بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔  
لیکن اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ایسا پاکیزہ معاشرہ قائم کرنے کی جدوجہد کریں  
جہاں نیکی پر چلنا آسان ہو جائے۔ ایسا معاشرہ نظام عدل و قسط کے نافذ ہونے ہی سے ممکن  
ہوگا۔ جہاں ہر شخص کی بنیادی ضروریات پوری ہو رہی ہوں، جہاں کسی کا حق نہ مارا جا رہا ہو

عثمان صادق

## ایمان افروز حکایات

### ایک قصاب کا قصہ

بنی اسرائیل کا ایک قصاب اپنے پڑوسی کی کنیز پر عاشق ہو گیا۔ اتفاق سے ایک دن کنیز کو اس کے مالک نے دوسرے گاؤں کسی کام سے بھیجا۔ قصاب کو موقع مل گیا اور وہ بھی اس کنیز کے پیچھے ہو لیا۔ جب وہ جنگل سے گزری تو اچانک قصاب نے سامنے آکر اسے پکڑ لیا اور اسے گناہ پر آمادہ کرنے لگا۔ جب اس کنیز نے دیکھا کہ اس قصاب کی نیت خراب ہے تو اس نے کہا:

"اے نوجوان! تو اس گناہ میں نہ پڑ، حقیقت یہ ہے کہ جتنا تو مجھ سے محبت کرتا ہے اس سے کہیں زیادہ میں تیری محبت میں گرفتار ہوں لیکن مجھے اپنے مالک حقیقی جزو جل کا خوف اس گناہ کے ارتکاب سے روک رہا ہے۔"

اس نیک سیرت اور خوف خدا عزوجل رکھنے والی کنیز کی زبان سے نکلے ہوئے یہ الفاظ تاثیر کا تیز بن کر اس قصاب کے دل میں پیوست ہو گئے اور اس نے کہا:

"جب تو اللہ عزوجل سے اس قدر ڈر رہی ہے تو میں اپنے پاک پروردگار عزوجل سے کیوں نہ ڈروں؟ میں بھی تو اسی مالک عزوجل کا بندہ ہوں، جا تو بے خوف ہو کر چلی جا۔"

اتنا کہنے کے بعد اس قصاب نے اپنے گناہوں سے سچی توبہ کی اور واپس پلٹ گیا۔

راتے میں اسے شدید پیاس محسوس ہوئی لیکن اس ویران جنگل میں کہیں پانی کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہ تھا۔ قریب تھا کہ گرمی اور پیاس کی شدت سے اس کا دم نکل جائے۔ اتنے میں اسے اس زمانے کے نبی کا ایک قاصد ملا۔ جب اس نے قصاب کی یہ حالت دیکھی تو پوچھا:

تجھے کیا پریشانی ہے؟

اور جہاں عدل و انصاف ہو رہا ہو۔ تب اللہ تعالیٰ بھی آسمان اور زمین سے ہمارے لیے خوشحالی کے تمام دروازے کھول دے گا۔ خوشحالی اور امن کا ایسا دور دورہ ہو گا جس سے انسانیت کو اب تک واسطہ ہی نہیں پڑا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے قلوب کی اصلاح اور تزکیہ فرمادے۔ ہمیں دین کو قائم کرنے کی جدوجہد میں حصہ لینے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ ہم دوسروں کے لیے بقول حضرت عیسیٰ علیہ السلام پہاڑی کے ایسے چراغ بن جائیں جن سے لوگ رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ ہمارے لیے بھی اور دوسرے لوگوں کے لیے بھی دین پر چلنا آسان ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایک خوبصورت اخلاقی شخصیت بننے کی توفیق عطا فرمائے اور ہم اللہ کی نظر میں ایک ایسا مومن بن جائیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے محبت کرنے لگے۔

حسن اخلاق کے سلسلے میں ہمیں رسول اللہ ﷺ کی درج ذیل مسنون دعائیں بھی ہمیں پڑھتے رہنی چاہیے۔ (اللهم احسن خلق فاحسن خلق) (رواہ احمد عن عائشہ رضی اللہ عنہا)۔

"اے میرے اللہ! تو نے اپنے کرم سے میری جسم کی ظاہری بناوٹ اچھی بنائی ہے، اسی طرح میرے اخلاق بھی اچھے کر دے۔"

نبی اکرم ﷺ تہجد کی نماز میں اکثر یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔

(اللهم اهدنی لاجسن الاخلاق فانه لا يهدى لاجسنها الا انت واصرف على سيئها لا يصرف عني سيئها الا انت) (صحیح مسلم عن حضرت علیہ رضی اللہ عنہ) "اے میرے اللہ! تو مجھ کو بہتر سے بہتر اخلاق کی طرف رہنمائی کر، تیرے سوا کوئی بہتر اخلاق کی طرف رہنمائی نہیں کر سکتا، اور بُرے اخلاق کو میری طرف سے ہٹا دے، ان کو تیرے سوا کوئی ہٹا بھی نہیں سکتا۔"

قصاب نے کہا "مجھے سخت پیاس لگی ہے۔"

یہ سن کر قاصد نے کہا: ہم دونوں مل کر دعا کرتے ہیں کہ اللہ عزوجل ہم پر اپنی رحمت کے بادل بھیجے اور ہمیں سیراب کرے یہاں تک کہ ہم اپنی بستی میں داخل ہو جائیں۔

قصاب نے جب یہ سنا تو کہنے لگا:

میری پیاس تو کوئی ایسا نیک عمل نہیں جس کا وسیلہ دے کر دعا کروں، آپ نیک شخص

ہیں آپ ہی دعا فرمائیں۔

اس قاصد نے کہا:

ٹھیک ہے میں دعا کرتا ہوں، تم آمین کہنا۔

پھر قاصد نے دعا کرنا شروع کی اور وہ قصاب آمین کہتا رہا، تھوڑی ہی دیر میں بادل کے ایک ٹکڑے نے ان دونوں کو ڈھانپ لیا اور وہ بادل کا ٹکڑا ان پر سایہ فگن ہو کر ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

جب وہ دونوں بستی میں پہنچے تو قصاب اپنے گھر کی جانب روانہ ہوا اور وہ قاصد اپنی منزل کی طرف جانے لگا۔

بادل بھی قصاب کے ساتھ ساتھ رہا۔ جب اس قاصد نے یہ ماجرا دیکھا تو قصاب کو بلایا اور کہنے لگا:

تم نے تو کہا تھا کہ میرے پاس کوئی نیکی نہیں اور تم نے دعا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ پھر میں نے دعا کی اور تم آمین کہتے رہے لیکن اب حال یہ ہے کہ بادل تمہارے ساتھ ہو لیا ہے اور تمہارے سر پر سایہ فگن ہے، سچ سچ بتاؤ تم نے ایسی کون سی عظیم نیکی کی ہے جس کی وجہ سے تم پر یہ خاص کرم ہوا؟

یہ سن کر قصاب نے اپنا سارا واقعہ سنایا۔ اس پر اس قاصد نے کہا:

"اللہ عزوجل کی بارگاہ میں گناہوں سے توبہ کرنے والوں کا جو مقام و مرتبہ ہے وہ دوسرے لوگوں کا نہیں۔"

بے شک گناہ سرزد ہونا انسان ہونے کی دلیل ہے مگر ان پر توبہ کر لینا مومن ہونے کی نشانی ہے۔ (حکایاتِ سعدی رحمۃ اللہ علیہ سے انتخاب)

پختہ ایمان

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے مہمان خانے میں چند مہمانوں نے کھانا کھایا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد حضرت انسؓ نے دیکھا کہ دسترخوان شور بہ لگ جانے سے زرد ہو گیا ہے۔ آپ نے خادمہ کو بلایا اور اسے دسترخوان دے کر فرمایا کہ اس کو جلتے ہوئے تندور میں ڈال دو۔ خادمہ نے حسب حکم ایسا ہی کیا۔ جملہ مہمانوں کو حیرت ہوئی اور دسترخوان کے جلنے اور اس سے دھواں اٹھنے کا انتظار کرنے لگے لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ آگ نے دسترخوان کو چھو تک نہیں۔ خادمہ نے اسے صحیح سلامت تندور سے نکالا۔ اس وقت وہ نہایت سفید اور صاف ہو چکا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے دھو کر اس کی میل نکال دی ہے۔

دوست احباب نے جب یہ ماجرا دیکھا تو حضرت انسؓ سے پوچھا:

"اے صاحب رسول! یہ کیا وجہ ہے کہ دسترخوان آگ سے محفوظ رہا اور پھر صاف بھی ہو گیا؟"

حضرت انسؓ نے فرمایا "اس کا سبب یہ ہے کہ حضور پر نور ﷺ نے اس دسترخوان سے بارہا اپنے دست مبارک اور لب مبارک کو صاف کیا تھا اس لئے اسے آگ نہیں جلا سکی۔"

مولانا روم فرماتے ہیں:

مولانا محمد حنیف ندوی

## یہودیت کے چار بنیادی نقص

بغیر کسی تمہید کے پہلے یہودیت کے بارے میں جدید ترین اور اہل علم کے حلقوں میں مسلمہ تنقیدی اسلوب فکر یہ ہے کہ یہ "دین" سے زیادہ تر "تاریخ" ہے اور ارتقا کا ایک عملیہ ہے جو ان افکار، خیالات اور رسوم و عوامد کا آئینہ دار ہے جس سے یہ عبرانی خروج (Exodus) کے بعد صدیوں تک دوچار ہوتے رہے۔ خروج سے پہلے کی کوئی دینی دستاویز محفوظ نہیں ہے اور عہد نامہ قدیم کے نام سے جو ذخیرہ ہم تک پہنچا ہے، وہ اسی تاریخ پر مشتمل ہے اور اس میں مندرج خیالات و افکار کو کوئی بھی پڑھا لکھا شخص وحی و تنزیل قرار نہیں دیتا، بلکہ اہل علم کے نزدیک اس کی حیثیت محض ایسے لٹریچر کی ہے جس میں یہودی فقہ، یہودی عوامد و رسوم اور یہودی تاریخ عقائد مرقوم ہے۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ پہلے ہی قدم پر یہ سارا ذخیرہ اس قطعیت و یقین سے محروم ہو گیا جو وحی و تنزیل کا خاصہ ہے۔

علاوہ ازیں اس میں چار بنیادی نقص ہیں:

پہلا نقص: یہودی فقیہوں اور فریسیوں نے یہودیت کے نام سے دین کے جس نقشے کو پیش کیا ہے، اس کا تعلق صرف انسان کی خارجی اصلاح سے ہے، قومی تنظیم سے ہے اور اس اجتماعی غلبہ و تسلط سے ہے جو یہودیوں کو غیر یہودیوں پر حاصل ہونا چاہیے۔ اس میں زندگی کے اس جوہر لطیف سے تعرض نہیں کیا گیا جس کا مسکن دل ہے، باطن ہے اور جس سے مقصود انسان کو ایسے داخلی عوامل سے روشناس کرانا ہے جو ایک طرف اس کو خارجی زندگی کے سنوارنے میں مدد دیں اور دوسری طرف تعلق باللہ کے پہلو کو استواری بخشیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نقشے میں اونچے صحتمند تصوف کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ حکیم یہود (Philo) کا معاملہ اس سلسلے میں بالکل جداگانہ ہے۔ (یہ مسیح سے کچھ پہلے پیدا ہوئے اور مسیح کے بعد کافی عرصے

اے دل! اگر تجھے آتش دوزخ سے نجات پانے کی فکر ہے تو رسول اللہ ﷺ کا قرب حاصل کر، جب آپ کے دست مبارک لگنے سے بے جان چیز کو جلنے سے بچا لیا گیا تو جو آپ کا عاشق زار ہوگا، جس کی آپ سے نسبت ہوگی وہ کیسے جلے گا۔

پھر مہمانوں نے خادمہ سے پوچھا کہ تو نے بلاتامل حضرت انسؓ کے کہنے پر بغیر سوچے سمجھے دسترخوان کو آگ میں ڈال دیا۔ کیا تو ڈری نہیں کہ اتنا قیمتی دسترخوان جل جائے گا؟ اس نے جواب دیا:

"میں حکم کی غلام ہوں اور مجھے یہ یقین ہے کہ آپ جو حکم فرمائیں گے وہ نقصان رساں نہ ہوگا۔"

مولانا روم نصیحت فرماتے ہیں "وہ شخص جس کا دل جہنم کی آگ اور عذاب سے خوفزدہ ہو اس کو چاہیے کہ ایسے مبارک ہاتھوں اور لبوں کے قریب ہو جائے جن کا طریقہ اتباع سنت ہو۔"

اے عزیزم!

مردانِ خدا کا دامن پکڑ جن کے لمس سے کندن بن جاؤ گے۔

درس حیات:

جس نے حضرت محمد ﷺ سے تعلق پیدا کر لیا، اس کی نجات ہوگی۔ یاد رکھو! آپ سے نسبت صرف اس صورت میں ہو سکتی ہے جب آپ کی کامل اطاعت کی جائے۔

تک زندہ رہے) ان کے فلسفہ تصوف میں ترک لذات اور لوگاس (Logos) کے ذریعے اتحاد باللہ کا تصور قطعی غیر عبرانی ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اسفارِ خمسہ سے کہیں زیادہ اس کا تعلق تو افلاطونیت (Neo – Platonism) سے ہے۔ لطف یہ ہے کہ ایک طرف تو ان کا یہ عجیب و غریب دعویٰ ہے کہ تمام یونانی فلسفہ کتب مقدسہ سے ماخوذ ہے، لیکن جب انہوں نے ایک مرتبہ نظام تصوف پر غور و فکر کیا تو اس کے بغیر کوئی چارہ کار نظر نہ آیا کہ اس نظام فکر کے لیے اُسی ثروتِ علمی سے استفادہ کریں جس کو یونانیوں نے مذاہب و ادیان سے الگ ہو کر ترتیب دیا تھا۔

دوسرا نقص: کسی دین میں انسانی روح و باطن کی بالیدگی یا پُروش کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس میں رحمت و عنف اور تربیت کا پہلو نمایاں ہو اور سزا و عقوبت کا پہلو کم ہو۔ اصلاح انسانی کا اولین تقاضہ یہ ہے کہ عام حالات میں ہر شخص کو نیک فرض کیا جائے، ان پر بڑی حد تک اعتماد کیا جائے اور اس کے قلب و ضمیر میں خدا کی دی ہوئی ایسی صلاحیتوں کو تسلیم کیا جائے جو تعلیم و تربیت سے جلا پا کر شہر پر قابو سکتی ہیں۔ لیکن اگر بات پر سزا و عقوبت کا اطلاق کیا جائے۔

### یہودیت کے چار بنیادی نقص

اور ہر ہر لغزش پر تعزیر و حدود کو حرکت دی جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ انسان دراصل نیک نہیں ہے، بلکہ اس کے برعکس اس کی فطرت میں بُرائی داخل ہے، اس کی گھٹی میں شر مضمحل ہے، لہذا بغیر عقوبت و سزا..... سختیاں جھیلے یہ راہِ راست پر آنے والا نہیں۔

ظاہر ہے اصلاح کا یہ اسلوب صحیح نہیں۔ عقوبت و سزا کے معاملے میں اس کا عدم توازن آخر آخر میں اس حد تک متجاوز ہو جاتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے گناہوں پر بھی عظیم و سخت سزا تجویز کی جانے لگتی ہے، مثلاً: اگر کوئی شخص "سبت" کا احترام نہیں کرتا تو بجائے اس کے کہ اس تساہل پر سرزنش کو کافی سمجھا جائے اور وعظ و تنذیر سے سبت کی اہمیت کا نقش دل میں بٹھایا

جائے، تورات کے مرتبین اس کے لیے سنگ سازی کی ہولناک سزا تجویز کرتے ہیں۔ یہ لطفہ بھی دیکھیے کہ "جریان" محض ایک بیماری ہے، مگر تورات کے مصنفین کے نزدیک یہ ایسی ناپاکی ہے کہ اگر کوئی ایسے مریض کو چھو لے تو وہ بھی ناپاک ہو جاتا ہے۔ (احبار، باب: ۱۵)

تیسرا نقص: یہودی شریعت کا نسبتاً زیادہ الم ناک پہلو اس کی ہر ہر مسئلے میں غیر ضروری اور شاخ در شاخ تفصیلات ہیں جن کو قرآن حکیم نے بجا طور پر طوق و سلاسل سے تعبیر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ کی رحمت ان تمام زنجیروں کو کاٹ دینا چاہتی ہی جن سے قلب و ذہن میں گھٹن کا احساس ہوتا ہے اور جو نشاطِ عملی کو روک دینے کا باعث ہوتی ہیں۔ (الاعراف: ۷)

تہذیب جس قدر سادہ اصولوں پر مبنی ہوگی، اسی قدر حسین اور مقبول ہوگی اور اسی نسبت سے اس میں قوموں کو آگے بڑھانے کی صلاحیتیں زیادہ ہوں گی۔ اور جس قدر پیچیدہ، مفصل اور شاخ در شاخ تفریعات سے اُلجھی ہوئی ہوگی، اسی نسبت سے انسانیت کے لیے وبال جان بن جائے گی۔ خود فطرت کے اس عظیم کارخانے کو دیکھیے جو ہمارے چاروں طرف اپنی عجوبہ طرازیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اس میں جو قوانین فطرت کار فرما ہیں، وہ کس درجہ مختصر ہیں! یہی اختصار اور سادگی اُس دین فطرت میں ہونی چاہیے جسے انسان کی تعمیر و ترقی میں حصہ لینا ہے۔

چوتھا نقص: مذاہب و ادیان میں اللہ تعالیٰ کا تصور کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ یہ تصور جس قدر اعلیٰ، منزہ اور محبت، رافت، عنف اور ربوبیت ایسی صفاتِ حسنہ سے اتصاف پذیر ہوگا۔ اسی انداز سے دلوں میں نقش ہوگا، اسی انداز سے دلوں میں گھر کرے گا اور اسی انداز سے اس کے ساتھ محبت و مودت کے داعیوں کو وابستہ کیا جاسکے گا۔ یہودیوں کے تصور الہ میں اصولی نقص یہ ہے کہ یہ پوری انسانیت کے لیے اچھا نمونہ ثابت نہیں ہوتا، چہ جائے کہ اس کے ساتھ کسی اونچے روحانی تصور کو اُستوار کیا جائے! اس کی صفات میں جنگبونی، انتقام اور سخت گیری کا

## ہمارے کچھ اہم معاملات احادیث نبوی کی روشنی میں

جس نے میری سنت سے محبت کی  
اس نے مجھ سے محبت کی

فرمایا: جس نے میری سنت (یعنی میرے طریقہ سے) محبت کی، اس نے گویا مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی، وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔ (جامع الترمذی ۲۶۷۸)

اللہ کے رسول کی سنتوں یعنی طریقوں پر عمل کرنے سے جنت میں اللہ کے رسول کے ساتھ ہونے کی خوش خبری بہت بڑی خوش خبری ہے، اس لئے اپنی زندگی کو اس کا نمونہ بنانے اور آپ کے اسوہ حسنہ کو اختیار کرنے کے لئے جتنی بھی کاوش ہو اور مزاج کو اس سے ہمہ آہنگ بنانے کے لئے جتنے بھی مجاہدے ہوں کم ہیں۔

جنت میں کوڑے کی جگہ کاملنا دنیا مافیہا سے بہتر ہونا

فرمایا: جنت میں کوڑے کی جگہ دنیا مافیہا سے بہتر ہے۔ (بخاری ۶۳۱۵)

اس حدیث شریف سے جنت کی عظیم الشان نعمت اور اس کی خوبصورتی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، ساری دنیا کی نعمتیں جب جنت کے کوڑے سے بھی کم حیثیت کی حامل ہیں تو دنیا کی نعمتوں سے دستبردار ہو کر بھی اس جنت کے حصول کے لئے کوششوں سے کام لینا، یہ سب سے بڑی دانشمندی ہے، لیکن یہ بد نصیبی کی بات ہے کہ ہمیں نہ صرف یہ کہ اس کا ادراک

رنگ نمایاں ہے۔ مزید برآں اس کی رہنمائی، اصلاح اور سربراہی کا دائرہ صرف ایک مخصوص قوم، فکر اور متعین تاریخ کی حد تک محدود ہے۔ اس کی ان صفات سے جن کا ذکر یہودی لٹریچر میں آیا ہے، کسی طرح بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ ذات گرامی ہمہ گیر اور زمان و مکان کی حد بندیوں سے آزاد اور ماوراء ہے، بلکہ یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ ان صفات کو یہودی قومیت کے تنگ نظر اور سٹے ہوئے تقاضوں نے جنم دیا ہے۔ (اساسیات اسلام، ص: ۲۷-۳۰)

نہیں ہے، بلکہ اہم اس کا ادراک حاصل بھی نہیں کرنا چاہتے، اس لئے کہ نفس ہم پر حاوی ہے، جو فانی نعمتوں پر فدا ہونے پر ہمیں مسلسل اکسارہا ہے، نفس سے معرکہ آرائی کئے بغیر جنت کے حصول کی کوشش محال ہے۔ اللہ کا فضل بھی کوششوں سے وابستہ ہے

اس بندہ میں خیر نہیں جس کا مال ضائع نہ ہو

فرمایا: اس بندہ میں کوئی خیر نہیں، جس کا مال ضائع نہ ہو، جو بیمار نہ ہو، جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو محبوب رکھتا ہے تو اسے مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے، اس طرح اسے صابر بنا دیتا ہے۔"

مصیبتیں بندہ مؤمن کے لئے زحمت کے پردہ میں رحمت ہوتی ہیں، اس لئے کہ ایک تو اس سے گناہ دھلتے ہیں، درجات بلند ہوتے ہیں، دوسرے یہ کہ اس سے عاجزی پیدا ہوتی ہے، تیسرے یہ کہ اس سے اللہ کی طرف رجوع میں اضافہ ہوتا ہے، اللہ سے مانگنے کا مزاج پیدا ہوتا ہے، چوتھے یہ کہ اس سے صبر کا مادہ پیدا ہوتا ہے، مال کا ضائع ہونا اور بیماری کا پیش آنا بظاہر یقیناً زحمت ہے، لیکن اس میں خیر کے بہت سارے پہلو موجود ہیں، جو دوسری احادیث سے بھی معلوم ہوتے ہیں۔

ذکر کرنے والے کا زندہ ہونا

فرمایا: ذکر کرنے والا زندہ ہے، ذکر نہ کرنے والا مردہ ہے۔ (بخاری ۲۰۸۹)

ذکر دراصل اس بات کی علامت ہے کہ فرد زندہ ہے اور اس میں ہر طرح کی نیکی کو سمجھنے اور اسے اختیار کرنے کی استعداد موجود ہے، ذکر سے محرومی دل کی مردگی کی علامت ہے، ایسے فرد کی نیکی کی حس دب جاتی ہے۔

سینہ کو کشادگی سے بھر دینے کی خوش خبری

فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے ابن آدم، تو میری عبادت کے لئے فارغ ہو جا تو میں تیرا سینہ بے نیازی (استغنا) سے بھر دوں گا اور تیرا فقر وفاقہ ختم کر دوں گا، اگر تو ایسا نہ کرے گا تو میں تمہاری مصروفیات کو بڑھا دوں گا۔

عبادت کے لئے فارغ ہونے سے سینہ کا دنیا کی بے نیازی سے بھرنا اور فقر وفاقہ کی حالت کا ختم ہونا، یہ بندہ کے ساتھ اللہ کا ایسا وعدہ ہے جو پورا ہو کر رہتا ہے، عبادت کے لئے فارغ ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فرد جائز روزی کے لئے محنت سے کام نہ لے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عبادت کے مزاج کو غالب کرے اور رجوع الی اللہ کے ملکہ کو مستحکم کرے، اس کے لئے ابتدا میں اگر زیادہ وقت صرف کرنا پڑے تو وہ وقت صرف کرے، ایسا کرنے سے ایک تو تھوڑی سی روزی میں بھی برکت ہوگی، دوسرے یہ کہ دنیا کے حوالے سے نہ ختم ہونے والی ہوس ختم ہوگی، سینہ غنا سے بھر جائے گا، اور ضرورت سے زیادہ دولت سے فرد کے مزاج میں کدورت پیدا ہوگی، نیز عبادت سے وہ لطف آئے گا کہ دنیا کی ساری دولت اور راحت کے سارے سامان سے بھی اس لطف کا آنا ممکن نہیں۔ اس وقت ہماری ملت پر بھوک، محتاجی اور افلاس کی حالت غالب ہے، لوگ بے بسی کی تصویر بن گئے ہیں، اس کا سبب بھی یہی ہے کہ اللہ سے دوری کی وجہ سے اللہ ہم سے ناراض ہے اور اس نے ہم پر ایسی قیادت مسلط کی ہے جس پر صرف اپنی فکر غالب ہے، جو ملت کی فکر سے عاری ہے، اپنی محتاجی کی حالت کو بدلنے کے لئے اللہ کی طرف رجوع ہونا ضروری ہے، اس حدیث کا سب سے بڑا پیام یہی ہے۔

لوگوں میں سب سے عقلمند شخص

فرمایا: لوگوں میں سب سے زیادہ عقلمند وہ شخص ہے جو دنیا (کی محبت) سے دستبردار ہونے میں سبقت سے کام لے۔"

دنیا کی زندگی انتہائی مختصر ہے، جو دیکھتے ہی دیکھتے گزر جاتی ہے، بچپن سے بڑھاپے کی عمر تک پہنچنے میں بظاہر تو وقت لگتا ہے، لیکن فرد پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے تو اسے زندگی کا یہ سارا وقت چند لمحوں سے زیادہ نظر نہیں آتا، ایسی دنیاوی زندگی سے محبت کرنا دانشمندی ہو کر گذر

نہیں، اصل دانشمندی تو یہ ہے کہ ملی ہوئی مختصر دنیاوی زندگی کو آخرت کی ابدی زندگی کے لئے سرمایہ جمع کیا جائے، جو نیک اعمال کی صورت میں ہی جمع ہو سکتا ہے۔

### بھلائی کی طرف بلانے والے کی فضیلت

فرمایا: بھلائی کی طرف بلانے والا بھلائی کرنے والے کی طرح ہے۔"

فرمایا: جس نے کسی کو نیکی کی طرف دعوت دی تو ایسے شخص کو ان سب کا اجر ملے گا جو نیکی پر عمل کریں گے۔"

نیکی کی طرف بلانا اور دعوت کا کام کرتے رہنا، یہ ہر اعتبار سے خیر و برکت کا کام ہے، اس کام کی برکت سے اپنی زندگی میں بھی بہتری آنے لگتی ہے، لیکن دعوت کے کام میں تاثیر اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب فرد خود بھی نیکی کی راہ پر گامزن ہو، اور اس کا عملاً ایک حد تک ہی سہی، نیکی کا مزاج پیدا ہو چکا ہو، مصلح بننے سے پہلے ایک حد تک صالح بننا ضروری ہوتا ہے، ایسے فرد کے دعوتی کام میں برکت ہوتی ہے، اس کے دعوتی کام سے متاثر ہو کر جو افراد بھی نیکی کی راہ اختیار کریں گے یا نیک عمل کریں گے، ان سب کا ثواب دعوت دینے والوں کو بھی برابر ملتا رہے گا، اس لئے اسلام دعوتی کام کو فیصلہ کن اہمیت دیتا ہے، موجودہ دور میں تو دعوتی کام کی زیادہ ضرورت ہے، لیکن اس کے لئے نیکی پر خود عامل ہونا شرط ہے، خود عامل ہو گا تو دعوتی کام کے سلیقہ سے بھی آشنا ہو گا، یعنی عمل کے نتیجہ میں اسے دعوتی حکمت عملی کی صلاحیت بھی عطا ہوگی۔

بوڑھے شخص کی دو چیزوں میں اضافہ ہوتے رہنا

فرمایا: بوڑھے شخص کی دو چیزوں کے بارے میں آرزوئیں جو ان رہتی ہیں، ایک دنیا

کے بارے میں (یعنی دنیا کی چاہت میں اضافہ ہوتا ہے) دوسرے لمبی لمبی امیدیں۔"

یہ حدیث شریف انسانی نفسیات کی بہت بہتر طور پر نشاندہی کرتی ہے کہ فرد اگر تڑکیہ کے مراحل سے گزر کر دل سے دنیا کی محبت کو نکالنے اور آخرت کی فکر کو غالب کرنے کے لئے کوشاں نہیں ہوتا تو اس صورت میں جوں جوں عمر بڑھتی جاتی ہے، اسی حساب سے دنیا کی محبت بھی بڑھتی ہے تو لمبی لمبی آرزوؤں میں بھی اضافہ ہونے لگتا ہے، وہ چاہنے لگتا ہے کہ زندگی کا باقی حصہ بھی دنیا کے راحت کے سامان کے حصول اور دنیا جمع کرنے میں صرف کرے، قرآن نے اس کے نشاندہی اللھم العکاف حعل زدم العاقر میں کی ہے، یہ انسان کے ساتھ سب سے بڑا المیہ ہے، اس المیہ سے بچنے کی واحد صورت نفس کو سنوارنے کے لئے اسے مجاہدوں سے گزارنے کی ہے، ورنہ نفس کی قوت ہر پھر کر فرد پر دنیاوی فکر ہی کو غالب رکھے گی۔ اس حدیث شریف میں اس کی نشاندہی فرمائی گئی ہے۔

گمراہ کن خواہشاتِ نفس کے بارے میں

فرمایا: میں اپنے بعد تمہارے بارے میں پیٹھ، شرم گاہ کے معاملات اور گمراہ کن خواہشاتِ نفس سے خائف ہوں۔ (مسند احمد)

یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں، جو ہر شخص کے ساتھ لگی ہوئی ہیں، پیٹھ لذت کی نئی نئی چیزوں کا طالب ہے اور دن میں بار بار چاہتا ہے کہ اسے اچھا کھانا میسر ہو، جنسیاتی جذبہ بھی ایسا ہے جو فرد کو بے چین رکھتا ہے، گمراہ کن خواہشات تو فرد کو ہر وقت بُرائی پر اکساتی رہتی ہیں، غرض کہ فرد نفس کے ساتھ ہر وقت معرکہ آرائی کی حالت میں ہے، جوں ہی فرد غافل ہوا، نفس اس کو زیر کر کے گناہوں میں مبتلا کرنے کا ذریعہ بنتا ہے، اس لئے بندہ مومن، نفس کی طرف سے ہر وقت چوکنا رہتا ہے، زمانہ جوں جوں رسول اللہ ﷺ کے دور سے دور ہوتا جا رہا ہے، اسی حساب سے نفس پرستی پر مبنی مادی تہذیب غالب ہوتی جا رہی ہے، مادیت پرستی کے اس سیلاب سے بچنے کے لئے نیک لوگوں کی صحبت کے ماحول میں رہنے کے ساتھ ساتھ غیر معمولی طور پر خود احتسابی سے کام لیتے رہنے کی ضرورت ہے۔

بے عمل، اہل علم کی قیامت کے دن حالت زار

”حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز ایک شخص لایا جائے گا، اسے آگ میں ڈالا جائے گا، تو اس کی انتڑیاں (پیٹ سے باہر) نکل آئیں گی، وہ اپنی انتڑیوں کو لیے اس طرح گھومے گا، جس طرح گدھا چلی کے گرد گھومتا ہے، اہل جہنم اس کے ارد گرد جمع ہو جائیں گے اور پوچھیں گے: اے فلاں! تمہارا یہ حال کیوں ہوا؟ کیا تم ہمیں نیکی کا حکم نہیں کرتے تھے، اور ہمیں برائی سے نہ روکتے تھے؟ وہ جواب دے گا۔ میں تمہیں اچھے کاموں کا حکم دیتا تھا اور خود وہ کام نہیں کرتا تھا اور میں تمہیں برے کاموں سے روکتا تھا اور خود برے کام کرتا تھا۔“ (صحیح بخاری)

اس طرح کی حدیثیں پڑھ کر اپنے حالت اعمال کو دیکھتے ہیں تو بڑا خطرہ نظر آتا ہے، اس کے فضل خاص کے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہیں، بے عملی اور غفلت کے ساتھ اس کے فضل کی امید رکھنا، اگرچہ بے عملی کو جواز فراہم کرنے کے مترادف ہے، لیکن کہاں ہمارے اعمال کہاں اس کی شان؟ اس لئے فرد ہر پھر کر اس سے اس کے فضل خاص کی بھیک مانگنے پر مجبور ہے۔ (اللہم حاسبنا حسابا یسیرا)۔

عام طور پر اہل علم کے پاس دوسروں کو دینے کے لئے معلومات اور تلقین کی تو بہت ساری باتیں ہوتی ہیں، لیکن وہ اپنے آپ کو بھول جاتا ہے اور اپنی شخصیت کو عمل پر آمادہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا، سبب یہ ہے کہ نفس کی قوتوں کو مفتوح کر کے، اسلام کے تابع کرنا دشوار ترین کام ہوتا ہے، جبکہ دوسروں کو تلقین کرنا سب سے آسان کام ہے، یہ حدیث شریف ایسی ہے کہ اگر اس کا استحضار موجود ہو تو فرد اپنے ساتھ ہونے والے حشر سے کانپ اٹھتا ہے، اس طرح اس کے لئے عمل پر آمادہ ہونا زیادہ دشوار نہیں ہوتا۔

زندگی کیا ملی ہے؟ سراسر خطرات سے پُر زندگی ہے، اور جہنم کے انتہات سے پُر۔ بندہ مؤمن سوچتا ہے کہ کاش وہ ایسی مخلوق ہوتا، جو ان خطرات اور حساب کتاب سے محفوظ ہیں۔ بس اللہ ہم سب کے ساتھ فضل خاص کا معاملہ فرمائے۔ (آمین)

ظاہر میں عبادت اور تنہائی میں گناہ کرنے والوں کے لئے انتباہ

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں اپنی امت کے ان افراد کو ضرور پہچان لوں گا، جو قیامت کے دن تہامہ کے پہاڑوں جیسی سفید (روشن) نیکیاں لے کر حاضر ہوں گے تو اللہ عزوجل ان (نیکیوں) کو بکھرے ہوئے غبار میں تبدیل کر دے گا۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! ان کی صفات بیان فرمادیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم ان میں شامل ہو جائیں اور ہمیں پتا بھی نہ چلے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ تمہارے بھائی ہوں گے، تمہارے کنبے اور قبیلے کے ہوں گے، جیسے تم راتوں کو عبادت کرتے ہو وہ بھی عبادت کریں گے، لیکن یہ لوگ جب تنہائی میں ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حرام کردہ کاموں کا ارتکاب کرنے لگیں گے۔“ (سنن ابن ماجہ)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ کے لئے اللہ کے فضل خاص کے بغیر چارہ کار ہی نہیں، ایک اہم بات جو اس حدیث شریف سے واضح ہوتی ہے کہ اعمال اور عبادت کے ساتھ ساتھ بُرے اعمال اور بُری عادتوں یعنی گناہوں کو چھوڑنا ناگزیر ہے، گناہوں کے ساتھ بڑی سی بڑی عبادت بھی قابل قبول نہیں ہے، اور وہ سزا سے بچانے کا باعث نہیں بن سکتی، اگرچہ عبادت میں یہ خاصیت موجود ہے کہ اس سے گناہوں سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے، لیکن جب عادت بد مزاج کا حصہ بن جاتی ہیں تو ان عادتوں سے گلو خلاصی حاصل کرنا دشوار تر ہو جاتا ہے، اس کے لئے غیر معمولی طور پر خود احتسابی سے کام لینا پڑتا ہے، نفس کا محاسبہ کر کے

صورت تھی کہ فرد دوسروں کے ہاں تبادلہ جا کر دعوت پہنچائے، موجودہ دور میں دعوتی کام کے لئے متعدد ذرائع پیدا ہو گئے ہیں، اصل مقصود دعوت کے کام میں صلاحیتوں، توانائیوں اور وقت کا استعمال ہے، جو افراد اپنی زندگیوں اس کام میں صرف کرتے ہیں، وہ بڑے خوش نصیب شمار ہوں گے۔

**عصبيت کی دعوت دینے والا ہم میں سے نہیں**

فرمایا: وہ شخص ہم میں سے نہیں، جو لوگوں کو عصبيت کی دعوت دے۔"

اس حدیث شریف میں حق کے مقابلہ میں ہر طرح کی عصبيت کی نہ صرف نفی کی گئی ہے، بلکہ اسے ایمان کے منافی قرار دیا گیا ہے یعنی ایسا شخص ہم میں سے نہیں۔

عصبيت جماعتی ہو، قویتی ہو یا مسلکی، ہر طرح کی عصبيت بد قسمتی سے حق و باطل کا معیار اپنے ساتھ لاتی ہے، عصبيت کے شکار افراد کی دل کی بینائی کی صلاحیت متاثر ہوتی ہے، صاحب ایمان فرد عصبيت سے ہر ممکن حد تک بچنے کے لئے کوشاں ہوتا ہے، وہ جس گروہ اور قومیت سے وابستہ ہوتا ہے، وہ اسے حق و باطل کا معیار ہر گز قرار نہیں دیتا، عصبيت سے امت گروہوں میں تقسیم ہوتی ہے۔

**تدبیر کا نصف سرمایہ زندگی ہونا**

فرمایا: تدبیر نصف سرمایہ زندگی ہے۔"

اس حدیث شریف میں تدبیر کی اہمیت بیان فرمائی گئی ہے اور کام کی عملی تدبیر اختیار کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے، لیکن تدبیر کے ساتھ ساتھ اصل یقین اللہ کی ذات پر ہونا چاہئے کہ جو کچھ ہوتا ہے، وہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور کسی بھی کام کا نتیجہ اللہ کی مرضی سے ہی

اسے تزکیہ کی راہ پر گامزن کرنے سے بُری عادتوں اور گناہوں سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے، اس میں مرئی و مزی کی صحبت بھی کردار ادا کرتی ہے کہ اس سے نفس کے اندر غوطہ زن ہو کر ایک ایک بُرائی کو سمجھنے، اس کا ادراک حاصل کرنے اور اس سے جان چھڑانے کی صورت پیدا ہوتی ہے۔

عبادت کی یقیناً اپنی جگہ اہمیت ہے، لیکن بُری عادتوں سے بچنا اس سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے، اس لئے کہ بُرائیاں نیکیوں کو کھا جاتی ہیں، یہ حدیث شریف اس کی بہتر طور پر نشاندہی کرتی ہے، یہ حدیث شریف بندہ مؤمن کو لرزادیتی ہے کہ جب عبادت بھی قابل قبول نہیں ہے تو وہ کیا کرے؟ خود احتسابی سے کام لے کر ایک ایک گناہ اور بُری عادتوں کو چھوڑے بغیر چارہ ہی نہیں ہے۔

خلوت و جلوت میں یکساں حالت میں ہونا، اس کے لئے نفس کو سنوارنے کے مجاہدوں کی ضرورت ہے، تاکہ اللہ کا استحضار غالب رہے۔

بندہ کو اللہ سے گڑگرا کر مانگتے رہنے کی بھی ضرورت ہے کہ یا اللہ، جہاں تو نے عبادت کی توفیق عطا فرمائی ہے، وہاں نفس کا تزکیہ کر کے بُری عادتوں اور بُرے اعمال سے بچانے کی استعداد بھی عطا فرما۔

**اللہ کی راہ میں نکلنے والوں کو نجات کی خوش خبری**

فرمایا: جس کے پاؤں اللہ کی راہ میں غبار آلود ہو گئے، اسے دوزخ کی آگ کبھی نہ چھوئے گی۔"

اس حدیث شریف میں دعوت کے کام کی اہمیت اجاگر فرمائی گئی ہے، جو شخص دعوت کے کام کو ہدف بناتا ہے، اس کے لئے وقت اور اپنی صلاحیتوں و توانائیوں کو استعمال کرتا ہے، ایسے فرد کو جہنم سے نجات کی خوش خبری سنائی گئی ہے، اُس دور میں دعوت کے کام کی یہی

تعلق رکھتا ہے، جائز ذرائع سے کام لینا اور تدا بیر اختیار کرنا ضروری ہے، لیکن یہ یقین بھی رکھنا چاہئے کہ سارے وسائل ہونے کے باوجود اگر اللہ نہ چاہے تو اس کی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی۔

اللہ کے ذکر کا سب سے افضل ہونا

فرمایا: کوئی نیک عمل اللہ کے ذکر سے افضل نہیں۔"

اس حدیث شریف میں اللہ کے ذکر کی غیر معمولی تاکید ہے، ذکر کی یہ اہمیت اس لئے بھی ہے کہ اس سے مزاج کی تشکیل اللہ پرستی کی بنیادوں پر ہونے لگتی ہے اور نفس، شیطان اور مادیت پسند قوتوں سے مقابلہ میں ذکر فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے۔

دلوں میں کینہ کا ہونا

ان کو اپنے حال پر چھوڑ دینا

فرمایا: ہر پیر اور جمہرات بندوں کے اعمال اللہ تعالیٰ کے روبرو پیش کئے جاتے ہیں، جس نے توبہ کی ہوتی ہے، اس کی توبہ قبول کی جاتی ہے اور جو بخشش کا امیدوار ہوتا ہے، اس کی بخشش کر دی جاتی ہے، لیکن جن کے دلوں میں کینہ ہوتا ہے، ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔"

یہ حدیث بتاتی ہے کہ کینہ ایسی بُرائی ہے جس کی وجہ سے بندہ معافی اور بخشش سے محروم ہو جاتا ہے، بد نصیبی سے موجودہ دور میں دوسروں سے بدگمانی اور کینہ و حسد کی بیماری عام ہو گئی ہے، سینہ اتنا تنگ ہو گیا ہے کہ مزاج کے خلاف معمولی بات برداشت کرنے کا حوصلہ نہ رہا ہے، دوسروں سے ان بنت، ناچاقی اور بدگمانی سے ایک تو معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگتا ہے، دوسرے یہ کہ ایسے افراد بخشش سے محروم رہ جاتے ہیں، کتنی بڑی سزا ہے

جو مفت میں دلوں میں کینہ اور حسد کو پالنے کی صورت میں ملتی ہے، سینہ کو کشادہ کرنے اور لوگوں سے یک طرفہ طور پر محبت کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ معاشرہ میں خیر سگالی بھی پیدا ہو سکے تو افراد اللہ کی رحمت کے بھی مستحق ہو سکیں۔

دوسروں تک پیغام پہنچانے پر

اللہ کے رسول ﷺ کی دعا

فرمایا: اللہ تعالیٰ اس شخص کو شاداب و مسرور رکھے، جس نے میرا پیغام سنا اور اسے دوسروں تک صحیح طور پر پہنچایا۔"

یہ حدیث شریف الفاظ کی کچھ تبدیلی کے ساتھ دوسری جگہ بھی آئی ہے، یہ حدیث شریف دین کے دعوتی کام کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے، چونکہ رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی تعلیمات سے لوگوں کی ابدی زندگی کی نجات وابستہ ہے، اور خود اس دنیا میں بھی بہت ساری سعادتیں اس سے متعلق ہیں، اس لئے دین کے پیغام کو صحیح طور پر دوسروں تک پہنچانے کا کام (جسے دعوتی کام کہتے ہیں) وہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے، ایسے فرد کو اللہ کے رسول ﷺ نے شاداب اور مسرور رکھنے کی عادی ہے، غیر مسلم اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ ان کو دین کی حقیقت سے آگاہ کیا جائے، تاکہ ان کے لئے جہنم کی ابدی سزا سے بچاؤ کی صورت پیدا ہو سکے، لیکن خود مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقات مادی نظریات اور مادی تہذیب سے متاثر ہو کر اسلام سے دور ہو رہے ہیں، بلکہ ان کی اکثریت سرے سے اسلام کی تعلیمات سے ہی واقف نہیں، ایسے لوگوں تک اللہ کے رسول ﷺ کا پیغام پہنچانا بہت بڑی سعادت کی بات ہے، لیکن یہی وہ کام ہے جس سے عمومی غفلت موجود ہے، اس کام کو کام ہی نہیں سمجھا

## مسکینوں والی زندگی عطا فرمانے کی دعا کرنا

فرمایا: یا اللہ مجھے مسکینوں والی زندگی عطا فرما اور مجھے موت بھی مسکینی کی حالت میں دینا اور قیامت کے دن میرا حشر بھی مسکینوں کے ساتھ کرنا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا، کیوں یا رسول اللہ؟ آپ ﷺ نے فرمایا، اس لئے کہ یہ مساکین مالداروں سے چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے، اے عائشہ، کبھی کسی مسکین کو واپس نہ لوٹانا، اگرچہ آدھی کھجور ہی کیوں نہ دو، مسکینوں سے محبت کرو اور انہیں اپنے قریب کر دو، اس لئے کہ اس سے اللہ تعالیٰ تمہیں قیامت کے دن اپنا قرب نصیب کرے گا۔ (جامع ترمذی)

اس حدیث شریف میں مسکینوں کی جو اہمیت بیان فرمائی گئی ہے، اسے دیکھ کر ہم میں سے ہر فرد کی یہ آرزو و تمنا اور کوشش ہونی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں مسکینی کی حالت میں رکھے، بس مسکینی کی اتنی حالت ہو کہ کسی کی محتاجی نہ ہو، مسکین ایک تو مال کی پیدا کردہ خرابیوں سے بچا ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ مسکینی کی طبیعت میں مسکینی اور سادگی و عاجزی کے اجزا غالب ہوتے ہیں، تیسرے یہ کہ مسکین مالداروں سے چالیس سال پہلے جنت میں جائیں گے، مالدار حساب کتاب کے انتظار میں ہوں گے جب کہ مسکین کے پاس کچھ ہوگا ہی نہیں تو وہ انتظار کس چیز کا کرے گا، چوتھے یہ کہ اللہ کے رسول ﷺ نے مسکینی کی حالت کو پسند فرمایا ہے اور آخرت میں مسکینوں کے ساتھ اٹھائے جانے کی دعا فرمائی ہے، مسکینوں کو واپس نہ لوٹانے اور ان سے محبت کرنے کا تاکید فرمانا، یہ اللہ کے رسول ﷺ کا ایسا فرمان ہے کہ اگر اس پر ہم میں سے ہر فرد عمل پیرا ہو تو مسکینوں کی محتاجی کی حالت باسانی ختم ہو سکتی ہے، مسکینی کی اتنی فضیلت ہونے کے باوجود مسکینوں والی زندگی کو عار سمجھ کر لگ بھگ ہر فرد کا مالداروں والی فہرست میں شامل ہونے کی آرزوں کا ہونا اور اس کے لئے کوشاں ہونا، یہ المیہ کی بات ہے۔

جارہا ہے، حالانکہ موجودہ ابلاغ کے دور میں یہ کام آسان ہو گیا ہے، اس کام سے فرار کے بہانے تلاش کئے جاتے ہیں، یہ دراصل نفس کی پیدا کردہ غفلت و سستی ہے، باصلاحیت فرد اس کام سے کسی صورت میں سبکدوش نہیں ہو سکتا۔

موت کے بعد بندہ کے تین

اعمال کا باقی رہنا

فرمایا: جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے، سوائے تین اعمال کے کہ (وہ منقطع نہیں ہوتے) ایک صدقہ جاریہ، دوسرے ایسا علم، جس سے فائدہ اٹھایا جائے، تیسرے نیک اولاد، جو اس کے لئے دعا کرے۔ (مسلم شریف)

یہ حدیث شریف ایسی ہے جو ہمیں اکساتی ہے کہ ہم زندگی میں اس طرح کے اعمال سرانجام دیں، جو موت کے بعد بھی ہمارے نامہ اعمال میں شامل ہوتے رہیں، اس طرح کے اعمال میں ایسے کام شامل ہیں، جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہوں، جن میں سماجی خدمت کے کام بھی ہیں تو مساجد اور مدارس کی تعمیر کے کام بھی۔

دوسری چیز جو کام آئے گی، وہ علمی خدمت کا کام ہے، جس میں کتابوں کی اشاعت کا کام اور تعلیم کے تسلسل کو قائم رکھنے کے کام وغیرہ شامل ہیں، تیسری چیز نیک اولاد ہے، جو نیکی پر قائم رہے، اس نیکی کے فوائد مرنے والے کو بھی ملتے رہیں گے، نیک اولاد میں روحانی اولاد بھی شامل ہے، جس کی تربیت و تزکیہ کر کے اس نے اسے تیار کیا ہوگا، اس کی نیکیوں کا اجر بھی اسے ملتا رہے گا۔

مومن بندہ کا آزمائش کی حالتوں میں رہنا

فرمایا: مومن مرد اور مومن عورت پر ہمیشہ آزمائش آتی ہی ہے، کبھی اس کی ذات میں، کبھی اس کی اولاد میں، کبھی مال میں، یہاں تک کہ جب وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرتا ہے تو گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ (جامع ترمذی)

ابتلا و آزمائش ہر بندہ مؤمن پر لاگو ہوتی ہے، بالخصوص جو اللہ کے جتنا قریب ہوتا ہے، اسی حساب سے اس پر آزمائشیں زیادہ آتی ہیں، یہ آزمائشیں جسمانی صحت کی خرابی کی صورت میں بھی ہوتی ہیں تو مال کی کمی کی صورت میں بھی۔ اور اہل باطل کی مخالفت کی صورت میں بھی۔

اس آزمائش سے ایک تو گناہ مٹتے ہیں، دوسرے یہ کہ اس سے عاجزی پیدا ہوتی ہے، تیسرے یہ کہ اس سے صبر کی نفسیات پیدا ہوتی ہے۔

قیامت کے دن اہل عافیت کی آرزو

کاش ان کی کھالیں کاٹ دی جاتی

فرمایا: قیامت کے دن جب آزمائش والوں کو ان کی مصیبتوں کا بدلہ دیا جائے گا تو اہل عافیت تمنا کریں گے کہ کاش ان کی کھالیں دنیا میں قینچیوں سے کاٹ دی جاتی، تاکہ انہیں بھی اسی طرح اجر ملتا۔ (جامع ترمذی)

یہ حدیث شریف بتاتی ہے کہ اہل مصیبت کو درجات کی بلندی کی صورت میں اجر دیا جائے گا، مصیبتیں دراصل زحمت کے پردے میں رحمت ہوتی ہیں۔

وادی میں بھٹکتے پھرنے کی سزا

فرمایا: جو فرد اپنے اوپر ایک ہی فکر کو طاری کر لیتا ہے (اللہ کی فکر کو، دین کی فکر کو اور آخرت کی فکری کو) تو اللہ اس کی ساری فکروں (اور ساری ضروریات) کے لئے کافی ثابت

ہوتا ہے، جو ایسا نہیں کرتا، اللہ کو اس بات کی پرواہ نہیں ہے کہ وہ کس وادی میں بھٹکتا پھرتا ہے۔"

یہ حدیث شریف ایسی ہے کہ اگر بندہ کو اس کا استحضار حاصل ہو تو وہ اللہ کے دین کی مخلصانہ اطاعت، نفس کی قوتوں سے معرکہ آرائی کر کے، خالص اللہ کے لئے ہو جانے اور دین پر استقامت سے چلنے اور اس کے لئے یکسو ہو جانے کے کام کو سارے کاموں پر ترجیح دینے کی راہ پر گامزن ہو، اس لئے کہ ایسا کرنے سے اسے اس بات کا روزمرہ زندگی میں مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ اس کے سارے فکروں، غموں اور ضروریات کے لئے اللہ کافی ثابت ہوتا ہے اور اس کے مسائل و مشکلات کے حل کی ایسی صورتیں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں کہ اس کے وہم و گماں میں بھی نہیں ہوتا، اللہ کا اپنے مخلص بندہ کے ساتھ یہ وعدہ ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ بندہ اپنے آپ کو اللہ کے لئے وقف کر لے، اس کی عبادت و اطاعت کو وظیفہ حیات بنا لے، اس کے دین کی خدمت کے کام کو اپنی صلاحیت کے تحت ہدف بنا لے، اس کے ذکر و فکر کے کام کو اولیت دے۔

جو فرد ایسا نہیں کرتا، ایسے فرد کے ساتھ نہ صرف یہ کہ اللہ کا کوئی وعدہ نہیں، بلکہ وہ مسائل زندگی کے ایسے نئے نئے بحرانوں میں مبتلا کر دیا جاتا ہے کہ یہ بحران اس کی زندگی کو اجیرن بنا دیتے ہیں، نیز اس کے لئے مسائل اور مشکلات سے نکلنے کے سارے راستے مسدود ہو جاتے ہیں، وہ چاہے معاشی اعتبار سے کتنا ہی خوشحال ہو، لیکن ان جانا سا خوف، مستقبل کی فکر مندی اور دل کی بے قراری اسے گھیرے رہتی ہے۔

اس طرح کے فرد کو دشوار گزار وادی میں بھٹکتے رہنے سے عبارت کیا گیا ہے، یہ وادی ایسی ہے کہ ایک مرتبہ اس وادی میں داخل ہونے کے بعد فرد کے لئے اس سے نکلنے کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔